عصرِ حاضر میں نظامِ زکوٰۃ

پروفیسر ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ترجمہ: حکیم اللہ ☆

نظامِ زکوٰۃ کو اپنے اہداف کے حصول میں کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ فرضیت زکوٰۃ کے لئے نظریہ توسیع کو اپنایا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے قابل نمو و افزائش مال کو قابل زکوٰۃ قرار دیا جائے۔ چاہے حضورﷺ نے اس کا نام لے کر اسے قابل زکوٰۃ قرار نہ بھی دیا ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ قرآن اور سنت کے عموم میں شامل ہو۔

ایسا کرنا اس رائے کے خلاف ہوگا جو فرضیت زکوٰۃ کے بارے میں چند محدود سوچ والے علماء رکھتے ہیں جیسے ابن حزم وغیرہ ہیں۔ انہوں نے صرف ایسے مال کو قابل زکوٰۃ قرار دیا ہے جس سے حضورؐ نے زکوٰۃ وصول کی تھی۔ اور وہ ان کی کتاب ''المحلیٰ'' کے مطابق آٹھ قسم کا ہے: (۱) اونٹ، (۲) گائے، (۳) بھیڑ-بکری، (۴) گندم، (۵) جو، (۶) کھجور، (۷) سونا اور (۸) چاندی[۱]۔ یہاں تک کہ کشمش کے بارے میں چونکہ ان کے نزدیک کوئی صحیح روایت موجود نہیں اس لئے اس کی زکوٰۃ کے بھی وہ قائل نہیں۔ ان کے نزدیک زرعی اجناس میں گندم، جو اور کھجور کے علاوہ اور معدنیات میں سونے اور چاندی کے علاوہ کسی چیز میں بھی زکوٰۃ فرض نہیں اسی طرح ان کے نزدیک اشیاء تجارت بھی زکوٰۃ سے آزاد ہیں۔

فقہاء میں سے کچھ تو زکوٰۃ کے دائرے کی محدودیت کے قائل ہیں جن کی رائے مذکورہ رائے سے قریب تر ہے اور کچھ اس دائرے کو اس قدر وسعت دینے والے ہیں کہ وہ اپنے دور کے ہر قسم کے افزائش پذیر مال کو اس میں شامل سمجھتے ہیں ان میں سب سے زیادہ وسیع المفہوم رائے امام ابوحنیفہؒ کی ہے۔ چنانچہ وہ زمین سے اگنے والی ہر ایسی چیز کو قابل زکوٰۃ سمجھتے ہیں جو افزائش کے لئے کاشت کی جاتی ہو یہاں تک کہ اس بارے میں وہ نصاب کی شرط بھی نہیں لگاتے اور ایسے گھوڑوں اور مویشیوں کو بھی قابل زکوٰۃ سمجھتے ہیں جو افزائش کی غرض سے پالے گئے ہوں۔ وہ زیورات میں بھی

☆ ریسرچ اسکالر، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

زکوٰۃ فرض سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ صرف شرعی مکلف پر ہی زکوٰۃ کو فرض قرار دیتے ہیں اور نابالغ اور پاگل کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ نیز وہ خراجی قسم کی زمین کو بھی عشر سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ یوں وہ مسلمانوں کی بہت سی اراضی کو زکوٰۃ کے دائرے سے باہر کر دیتے ہیں۔

ابن حزم اور اُن سے متفق شوکانی اور صدیق حسن خان(۲) جیسے علماء کا دائرہ زکوٰۃ کو تنگ کرنے والا نظریہ دو بنیادوں پر قائم ہے:-

۱۔ مسلمان کے مال کا احترام واضح دلائل سے ثابت ہے لہذا مسلمان کا مال واضح دلیل کے بغیر نہیں لیا جا سکتا۔

۲۔ زکوٰۃ ایک شرعی فریضہ ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ فرائض واضح دلائل کے بغیر لاگو نہیں کئے جا سکتے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ہم اسلام میں قانون سازی نہیں کر سکتے۔

اور قیاس تو چونکہ بالکل ہی باطل اور غلط ہے لہذا ابن حزم کے نزدیک اس کا کوئی کردار نہیں بالخصوص زکوٰۃ کے بارے میں۔ ابن حزم اور ان کے ہم خیالوں کی جولان گاہ، ان کی سوچ اور اجتہاد کی بنیاد تو اس بارے میں یہی ہے مگر ہماری سوچ اس سے یکسر مختلف ہے اور وہ ان دو بنیادوں کے برعکس جن بنیادوں پر مبنی ہے انہیں ذیل میں مختصراً بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ قرآن و سنت کی عمومی تعلیمات بتاتی ہیں کہ ہر قسم کے مال میں صدقہ یا زکوٰۃ فرض ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: **"والذین فی اموالھم حق معلوم"** (المعارج آیۃ ۲۴) اور فرمایا گیا ہے: **"خذ من اموالھم صدقة"** (التوبۃ آیۃ، ۱۰۳)

نبی کریمؐ نے فرمایا ہے: **"اعلمھم ان اللّٰہ فرض علیھم فی اموالھم صدقة تؤخذ من اغنیاء ھم فترد الی فقراء ھم"** انہیں بتا دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال میں زکوٰۃ فرض کر دی ہے جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان ہی کے ضرورت مندوں کو لوٹا دی جائے گی۔ نیز حضور ﷺ نے فرمایا ہے: **"ادوا زکوٰة اموالکم"** اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دو۔ یہاں مال کی کوئی خاص قسم نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ہر قسم کا مال اس میں شامل ہے۔

سنت سے معلوم ہوا کہ ان عبارات میں مال سے مراد افزائشی مال ہے نہ کہ ذاتی استعمال والی اشیاء۔ لہذا بغیر دلیل کے کسی مال کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینا جائز نہیں۔ قاضی ابن العربی نے ظاہریہ کا یہ قول مسترد کیا ہے کہ اشیاء تجارت میں زکوٰۃ فرض نہیں، اس لئے کہ اس بارے میں کوئی مخصوص دلیل موجود نہیں اور بہت ہی اچھی بات یہ کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: **"خذمن اموالھم صدقة"**

ان کے مال میں سے زکوٰۃ لو۔ ہر قسم کے مال پر مشتمل ہے خواہ اس کی قسم اس کا نام اور اس کے مقاصد کچھ بھی ہوں اور جو کوئی اس کو کسی خاص چیز تک محدود رکھنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ اس کے لئے دلیل پیش کرے(۳)۔

۲۔ ہر دولت مند کو تزکیہ اور تطہیر کی ضرورت ہے یعنی خرچ کر کے تزکیہ حاصل کرے اور بخل اور انانیت کی برائی سے خود کو پاک کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها**" (ان کے مال سے زکوٰۃ لے کر اس طرح ان کا تزکیہ اور تطہیر کریں)۔

اس میں کوئی معقولیت نہیں کہ گندم اور جو کے کاشت کاروں پر تو زکوٰۃ فرض ہو لیکن سیب، آم، اور چائے کے باغات کے مالکان یا کارخانوں اور ایسی بڑی بڑی عمارتوں کے مالکان پر فرض نہ ہو دراں حالیکہ اُن سے اتنی آمدنی حاصل ہو جو زرعی پیداوار سے کئی گنا زیادہ بنتی ہو حالانکہ بسا اوقات کاشت کار اراضی کے مالک نہیں ہوتے بلکہ محض پٹہ دار یا مزارع ہوتے ہیں۔

حنفی فقیہ علامہ کاسانیؒ نے کہا ہے کہ زرعی پیداوار میں زکوٰۃ کی فرضیت نقلی دلیل کے ساتھ عقلی دلیل سے بھی ثابت ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ غریب کو عشر دینے سے ایک طرح سے نعمت خداوندی کی شکرگزاری ہوتی ہے، اور کمزور و ناتواں کو فرائض خداوندی کی ادائیگی میں قوت فراہم ہوتی ہے۔ اس سے انسان کا دل بخل اور کنجوسی اور گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور یہ مقصد انفاق اور خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا یہ ساری چیزیں دانش اور دین دونوں کی رو سے لازمی ہیں(۴)۔

کاسانیؒ نے بھی بالکل صحیح کہا ہے کہ زکوٰۃ ہر دولت مند پر لازم ہے، اس میں کاشت کار اور باغبان کی طرح دیگر دولت مند بھی بلاامتیاز شامل ہیں۔

۳۔ ہر قسم کا مال تطہیر چاہتا ہے کیوں کہ اس کی کمائی اور افزائش کے عمل میں کئی قسم کا مشکوک و مشتبہ مال آ سکتا ہے۔ مال کی تطہیر زکوٰۃ نکالنے سے ہوتی ہے جیسا کہ ابن عمرؓ کی ایک صحیح روایت ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو مال کی تطہیر کے لئے فرض کیا ہے''(۵)۔

کچھ روایات میں یہ بھی ہے کہ ''اپنے مال کی زکوٰۃ نکال دو گے تو مال کی برائی کو اپنے سے دور کر دو گے(۶)۔

اس میں کوئی معقولیت نہیں کہ ایسی تطہیر صرف ان آٹھ قسم کے مال تک محدود رہے۔ جو ابن حزم

نے ذکر کیئے ہیں اور ان کے علاوہ ایسے مال کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے جو آج کل دولت کا ستون بنا ہوا ہے، کیوں کہ ہر قسم کا مال تطہیر کا متقاضی ہے اور زکوٰۃ کی صورت میں اس کی برائی کو دور کرنا چاہیئے۔

۴۔ زکوٰۃ چونکہ صرف اور صرف غریبوں، مقروضوں اور مسافروں کی حاجت براری کے لئے مسلمانوں کے مفاد عامہ کے کاموں، جہاد فی سبیل اللہ، دلوں کو اسلام سے مانوس کرنے اور باہمی تعلقات کو درست رکھنے جیسے مقاصد کے لئے فرض کی گئی ہے جس سے دین اور حکومت کو تقویت ملتی ہے لہذا یہ ضروریات پوری کرنا اور یہ مقاصد حاصل کرنا ہر دولت مند مسلمان کا فرض ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بوجھ کو پانچ اونٹوں، چالیس بکریوں، پانچ وسق جَو کے مالکان پر تو ڈال دے اور ایسے بڑے دولت مندوں کو معاف رکھے جو بڑے بڑے کارخانوں اور بڑی بڑی بلڈنگز کے مالک ہوں یا ڈاکٹر، انجینئر، بڑے افسران یا آزاد پیشے والے لوگ ہوں حالانکہ وہ ایک دن میں اتنا کماتے ہیں جو پانچ اونٹوں، یا پانچ وسق جو کمانے والے سالوں میں بھی نہیں کما سکتے۔ اسلام کی نظر میں مال کا اصلی اور حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، انسان تو اس کی طرف سے محض نائب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کنبہ کے افراد کے طور پر غریب اور ضرورت مند لوگوں کا دولت مند کے مال میں حصہ رہتا ہے اسی طرح ملت کے مشترکہ مفادات بھی فی سبیل اللہ ہونے کے ناطے اس مال میں اپنا حق رکھتے ہیں اور اس بارے میں ہر قسم کا مال یکساں حیثیت رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کا دولت مند شامل ہے چاہے یہ دولت زرعی شکل میں ہو، صنعتی یا تجارتی شکل میں ہو یا کسی دیگر آزاد پیشے سے حاصل کی گئی ہو۔

۵۔ چونکہ تمام فقہاء کے نزدیک قیاس بھی شریعت کی بنیادوں میں سے ایک ہے اور اس سے اختلاف رکھنے والے صرف ابن حزم اور اس کے ظاہریہ بھائی ہیں۔ لہذا ہر قسم کے افزائش پذیر مال کو ہم اس مال پر قیاس کرتے ہیں جس میں سے حضورؐ اور آپ کے صحابہ نے زکوٰۃ وصول کی ہوئی ہے۔ اور ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک جیسی چیزوں کے حکم میں شریعت فرق نہیں کرتی اسی طرح وہ دو مختلف چیزوں کے لئے ایک ہی حکم بھی نہیں دیتی، اس لئے قیاس کے ذریعے سے مال میں زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بتاتے وقت گویا ہم شریعت ہی کا حکم بتاتے ہیں اور ہم دین میں اپنی طرف سے کچھ شامل کرنے والے نہیں، بالخصوص جب ہمیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ محض عبادت ہی نہیں بلکہ یہ اسلام کے معاشرتی اور مالیاتی نظام کا حصہ ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں قیاس کا استعمال کوئی نئی چیز بھی نہیں اور نہ ہی غیر معروف ہے کیوں کہ صحابہؓ کے دور میں ایسا ہو چکا ہے۔

(ا) حضرت عمرؓ نے گھوڑوں میں سے زکوٰۃ کی وصولی کا تب حکم دیا جب انہیں خیال ہوا کہ اس کی

قیمت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ نے بھی ان کی پیروی کی لیکن اس صورت میں جب وہ خود چرنے والے ہوں اور مالی اور نسلی افزائش کے لئے ہوں۔

(ب)امام احمد بن حنبل نے شہد میں زکوٰۃ فرض قرار دی ہے کیوں کہ حدیث میں آیا ہے اور اس لئے بھی کہ اسے زرعی پیداوار اور پھلوں پر قیاس کیا گیا ہے۔ انہوں نے ہر قسم کی معدنیات میں بھی زکوٰۃ فرض قرار دی ہے اور ان کو سونے اور چاندی پر قیاس کیا ہے۔

(ج) امام زہریؒ، حسن بن زیاد اور ابو یوسفؒ نے سمندر سے نکلنے والی چیزوں (جیسے موتی اور عنبر وغیرہ ہیں) میں خُمس (پانچواں حصہ) فرض قرار دیا ہے اور ان کو دفینے اور معدنیات پر قیاس کیا ہے۔

(د) مسلمہ مذاہب میں سے ہر ایک نے زکوٰۃ کے متعدد مسائل میں قیاس کو استعمال کیا ہے مثلاً امام شافعیؒ نے غالب آبادی یا کسی کی ذاتی استعمال میں آنے والی خوراک کو صدقہ فطر کے بارے میں حدیث میں مذکور کھجور، کشمش، گندم یا جو پر قیاس کیا ہے یا مذکورہ بالا چار چیزوں پر ہر قسم کے کھانے کی ان چیزوں کو قیاس کیا گیا ہے جن کو زرعی اور پھلوں کی پیداوار کے عشر میں نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔

۶۔ ہم مسلمان کی ملکیت کے احترام اور ذاتی ملکیت کے حق کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یا دوسرے الفاظ میں معاشرے کا نیز غریبوں اور محتاجوں کا حق بھی اس مال میں واضح دلائل سے ثابت ہے۔

ابن حزم نے بذاتِ خود اس کی تائید کی ہے کیوں کہ انہوں نے زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حقوق فرض قرار دیئے ہیں اور انہوں نے حکام کو یہ حق دیا ہے کہ وہ دولت مندوں کو مجبور کریں کہ وہ غریبوں کا حق ادا کریں اور غریبوں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا حق جبراً بھی لے سکتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بھوکا اور ننگا ہونے سے بچائیں(۷)۔ مگر بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دیگر حقوق عائد کرنے کے بجائے پہلے ہر قسم کے مال میں زکوٰۃ کو فرض قرار دیا جائے اور ہر قسم کے دولت مندوں کو اس میں شامل رکھا جائے پھر اگر ضرورت باقی رہے تو ہم تمام دولت مندوں سے کہیں کہ تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

رہا یہ سوال کہ حضورؐ نے اپنے دور میں کچھ افزائش پذیر قسم کے مال میں سے زکوٰۃ نہیں لی جیسے حیوانات میں سے گھوڑے ہیں اور زرعی پیداوار میں سے سبزیاں ہیں۔ اس کا جواب دو طرح سے ہے:

☆ ایک تو یہ ہے کہ اس کی افزائش اس وقت بہت کمزور تھی اس لئے اسے معاف کر دیا گیا اور لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس کی تائید حضورؐ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: ''میں نے تمہیں گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ سے معاف کر دیا ہے''(۸)۔

☆ دوم یہ کہ انہوں نے لوگوں کے ضمیر اور ایمان پر یہ چھوڑ دیا۔ ان کے وصول نہ کرنے سے یہ ضروری نہیں ٹھہرتا کہ لوگوں نے خود بھی اپنے آپ کو پاک کرنے کے لئے ان چیزوں کی زکوٰۃ نہیں نکالی۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ دینی طور پر مال میں حق رہتا ہے اور زکوٰۃ نہ نکال کر مال میں برکت نہیں رہتی۔

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ کے قانون کے اجراء کے وقت ایک مخصوص مذہب کو یا کسی مذہب کی معروف رائے کو اپنانا اور دیگر قابل اعتماد مذاہب کی طرف دروازہ بند کرنا اور درست شرعی ترجیحات پر مبنی نئے اجتہاد کو مسترد کرنا، جیسا کہ کچھ ایسے قوانین میں دیکھا گیا ہے جو کئی اسلامی ملکوں میں زکوٰۃ کے بارے میں جاری کئے گئے ہیں، اس سے زکوٰۃ کی وصولی اس قدر کم ہوگی کہ اس سے مطلوبہ ضرورتیں پوری نہ ہوسکیں گی۔ جیسا کہ ان ملکوں میں ہو چکا ہے جو اپنے ہم وطنوں سے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں۔ نیز اس کا ایک اور منفی نتیجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح دولت مندوں میں ایک واضح فرق رکھا جاتا ہے۔ کسی پر تو زکوٰۃ فرض ہے اور کسی پر نہیں بلکہ بعض اوقات تو تھوڑے مال والے پر فرض ہے اور زیادہ والے پر نہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں کئی سال تک مشرق بعید کے ملکوں میں جاتا رہا جن میں ملیشیا اور انڈونیشیا شامل ہیں بالخصوص ملیشیا میں مجھ سے اور ملایو یونیورسٹی کے ذمہ داراں، اساتذہ اور طلبہ سے بار بار جو سوالات پوچھے جاتے تھے ان میں یہ سوال بھی ہوتا تھا کہ کیا یہ درست ہے کہ اسلام کی اقتصادی پالیسی میں ایسے بڑے بڑے زمیندار جو سینکڑوں یا ہزاروں ایکڑ اراضی پر قائم ربڑ، چائے، ناریل یا آم وغیرہ پھلوں کے باغات کے مالک ہوں، زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں جبکہ ایسے چھوٹے زمینداروں پر زکوٰۃ فرض ہے جو گندم یا چاول کے چھوٹے قطعات پر کاشت کاری کرتے ہیں اور ان کی اکثریت زمین کی مالک نہیں بلکہ مزارع اور پٹہ دار ہوتی ہے؟

یہ سوال محض تصوراتی نہیں بلکہ وہاں پر موجود حقیقت کی تعبیر ہے یہ ایسی صورت ہے جس کو کمیونسٹوں وغیرہ نے خوب استعمال کیا ہے تاکہ مہذب مسلمانوں کی نظروں میں زکوٰۃ کی شکل اور حقیقت کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔

اس صورت حال کے پیدا ہونے کا سبب شوافع کے اصولِ زکوٰۃ کی اتباع ہے جس میں صرف ایسی غذاؤں پر زکوٰۃ فرض ہے جو خوردنی ہوں علاوہ ازیں کسی چیز پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ یہ موقع نہیں کہ میں اس بارے میں بحث کروں کیوں کہ اس پر میں اپنی کتاب ''فقہ الزکوٰۃ''(۹) میں بحث کر چکا ہوں جو دیکھی جا سکتی ہے۔ اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امام شافعیؒ وغیرہ علماء کی رائے ایک اجتہادی رائے ہے انہیں اس کا اجر ملے گا چاہے صحیح ہو چاہے غلط۔ ہم اگر دیکھیں کہ اس کی بنیاد کمزور ہے اور اس کے برعکس اس کی مخالف رائے کی بنیاد مضبوط ہے تو ہم اس رائے کو چھوڑ سکتے ہیں۔

مذہب کی تقلید اور پابندی کو ماننے والے علماء خود بھی یہ کہتے ہیں کہ مقلد کے لئے یہ جائز ہے کہ کسی مسئلے میں اپنے امام کی رائے کو مشروط یا غیر مشروط طور پر چھوڑ کر دوسرے امام کی رائے کو قبول کرے۔ مثلاً وہ دیکھے کہ کسی مسئلے میں اپنے امام سے دوسرے امام کی بات زیادہ مضبوط ہے اور اس کو اس پر قلبی اطمینان حاصل ہو اور صرف کھیلنا مقصود نہ ہو(۱۰)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت بڑے بڑے علماء نے کئی مسائل میں دلائل کی بنیاد پر اپنے مذہب کو ترک کیا ہے۔

پیش نظر مسئلے میں قاضی ابن العربی کو ہم دیکھتے ہیں جو کہ مالکی مذہب کے ہم عصر علماء کے سردار رہے ہیں، انہوں نے بھی اپنے امام یعنی مالک کے مذہب کو چھوڑا ہوا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کو ترجیح دی ہے مثلاً انہوں نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۴۱ کی تفسیر میں زرعی پیداوار کی زکوٰۃ کے بارے میں فقہی مذاہب کو بیان کیا ہے اور ان کے مآخذ یعنی نقلی اور عقلی دلائل کو بھی بیان کیا ہے اور بعد میں یہ کہا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس آیۃ کو آئینہ بنا کر حق کو دیکھ لیا ہے اور ہر کھائی جانے والی زرعی پیداوار میں زکوٰۃ فرض قرار دی ہے خواہ وہ غذا کے طور پر کھائی جاتی ہو یا نہیں۔ اور حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے ''جو چیز بارش سے سیراب ہو اس میں عشر فرض ہے''(۱۱) اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اس حدیث کی شرح میں انہوں نے اپنی کتاب ''عارضہ الاحوذی فی شرح الترمذی'' میں اس مسئلے کو پھر چھیڑا ہے اور کہا ہے کہ: ''اس مسئلے میں دلائل کے اعتبار سے مضبوط ترین مذہب امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔ یہ مذہب غریبوں کے مفاد کے لئے بھی زیادہ محتاط ہے اور نعمت خداوندی کے شکر ادا کرنے کے لئے بھی زیادہ موزوں ہے اور آیۃ اور حدیث کا عموم بھی یہی بتلاتا ہے(۱۲)۔

ایک عظیم مالکی فقیہ کی یہ بات نہایت منصفانہ ہے حالانکہ بعض مسائل میں وہ حنفی فقہ کے شدید مخالف ہیں۔ مگر حق کی پیروی کر لینی چاہئے اور پیغمبر ﷺ کے علاوہ کسی کی بھی کوئی بات اپنائی جا سکتی

ہے اور کوئی نہیں، مذہبی پابندی کرنے والے بھائیوں کو یہ چیز اپنا لینی چاہیئے۔ چاہے اس کی مثال عام قانون بنانے کی صورت میں ہی کیوں نہ قائم کرنی پڑے۔

زرعی پیداوار اور پھلوں کی زکوٰۃ کے بارے میں امام شافعیؒ کے مذہب کے یہ پیروکار علماء یہ نہیں جانتے کہ اگر خود امام شافعیؒ اس وقت موجودہ حالات میں زندہ ہوتے اور اِن بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کرتے تو وہ بھی اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر نیا اجتہاد فرماتے۔ یہ بات باعث تعجب نہیں کیوں کہ بہت سے مسائل میں ان کی دو مختلف آراء موجود ہیں۔ ایک عراق میں قدیم رائے کے طور پر اور دوسری مصر میں جدید رائے کی صورت میں۔ اور ان کے مذہب میں یہ عام طور پر معروف ہے۔ امام شافعیؒ کی قدیم رائے یہ ہے اور جدید رائے یہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مصر میں وہ چیزیں دیکھیں اور سنیں جو عراق میں نہ دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں۔ اس لئے ان کے اجتہاد کے بدلنے میں کوئی تعجب نہیں۔

مختصر یہ کہ تمام مسائل اور پیچیدگیوں میں بقیہ تمام مذاہب کو چھوڑ کر کسی ایک مذہب کی پابندی سے ایسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جو مذاہب کے ائمہ خود بھی نہیں چاہتے تھے اور جن سے اسلامی انصاف کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے دور میں ایک عام قانون جاری کرتے وقت یہ ضرور کرنا چاہیئے کہ مذہبی اجتہادات میں سے ایسے اجتہاد کا انتخاب کر لیا جائے جو دلائل کے اعتبار سے راجح اور مأخذ کے لحاظ سے مضبوط ہو۔ ایسا کرنا شرعی مقاصد اور عوام کے مفاد کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

اگرچہ ایک مسلمان کے لئے یہ تو جائز ہے کہ کسی ایک مذہب کا پابند رہے، اس مذہب کی جملہ آراء، اس کی عزیمتوں اور رخصتوں کو اپنائے رکھے، اس کی سختی اور نرمی کی پابندی کرے، خواہ دلائل کی رو سے مضبوط ہو اور خواہ کمزور مگر ایسا کرنا ایسے معاملات میں جائز نہیں جن کا تعلق عوامی اور معاشرتی مسائل سے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے آسانی پیدا کی ہو، ہم تنگی کیوں اختیار کریں۔ حالانکہ ہمارے پاس مذہبی ائمہ عظام کے اجتہادات کا ایسا بھاری فقہی ذخیرہ موجود ہو جس کی قدر و قیمت کا اعتراف علمی اور قانونی ماہرین یہاں تک کہ غیر مسلم ماہرین بھی کر رہے ہوں۔

اموالِ ظاہرہ اور باطنہ دونوں میں سے زکوٰۃ کی وصولی

پہلی شرط کی تکمیل کے لئے دوسری شرط کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ زکوٰۃ کافی مقدار میں حاصل

ہوسکے اور یوں وہ بڑے اہداف حاصل کئے جا سکیں جن کا حصول مطلوب ہے اور وہ تمام مسائل حل ہوسکیں جو زکوٰۃ سے ہی حل ہونے کے لائق ہوں۔

جو لوگ خلوصِ دل کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ کا نظام قائم ہو انہیں خدشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ نظام تو قائم ہو اور لوگ اس سے بڑی بڑی توقعات لگائیں مگر وہ اس قدر کم مال وصول کریں جس سے یہ توقعات پوری نہ ہوسکیں، بالخصوص اس صورت میں جب ہم رائج رائے کو اپنا کر اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول نہ کریں بلکہ یہ عوام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے اور نظام زکوٰۃ کا اس سے سروکار نہ رہے۔

ہمیں اس بارے میں کچھ روشنی ڈالنی چاہیے۔ علماء نے قابلِ زکوٰۃ مال کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ۔

اموال ظاہرہ ایسے مال کو کہا جاتا ہے جس کے بارے میں مالک کے سوا دوسروں کو بھی اس کی نوعیت اور مقدار کے بارے میں علم ہو سکتا ہو۔ اس میں زرعی پیداوار، پھل، اُونٹ، گائے اور بکریاں جیسے مویشی شامل ہیں۔

جبکہ اموال باطنہ سے مراد سونا چاندی اور اشیاء تجارت ہیں۔

صدقہ فطر کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں کچھ تو اسے اموال ظاہرہ والے دائرے میں شمار کرتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے اسے اموال باطنہ کے دائرے میں شامل کرتے ہیں۔

اموال ظاہرہ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ان کی زکوٰۃ کی وصولی اور پھر مستحقین میں اس کی تقسیم کا حق مسلمان حکمران کو حاصل ہے۔ یہ کام افراد کے خود کرنے کا نہیں کہ اسے ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کیوں کہ متواتر روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ اپنے عملہ کو زکوٰۃ کی وصولی کے لئے مسلمانوں کے پاس بھیجا کرتے تھے اور مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے کہ حکومت کو زکوٰۃ دیں اور حکم تھا کہ جو نہ دیں اُن سے زبردستی وصول کی جائے(۱۳)۔ یہی وجہ ہے کہ جب کچھ عرب قبائل نے حضرت ابوبکرؓ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا حالانکہ یہی لوگ حضورؐ کے عہد میں زکوٰۃ دیا کرتے تھے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا ''خدا کی قسم اگر یہ لوگ ایک بکری کا بچہ بھی روک لیں گے جو یہ حضور ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں ان سے لڑوں گا'' یہ اموال ظاہرہ بلکہ بالخصوص مویشیوں کے بارے میں تھا۔ لیکن اموال باطنہ یعنی سونے چاندی اور اشیاء تجارت کے بارے میں علماء کا اس پر تو اتفاق ہے کہ مسلمان حکمران کے لئے یہ تو جائز ہے کہ وہ اس زکوٰۃ کو خود وصول و تقسیم کرے مگر کیا

زکوٰۃ بالجبر بھی وصول کی جا سکتی ہے اور اس کے لئے جنگ و جدل کا جواز ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا؟ تو اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔

میری رائے تو یہ ہے کہ جن شرعی دلائل سے یہ ثابت ہے کہ یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے ان سے تو اموال ظاہرہ اور باطنہ میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور جہاں کہیں مسلمان حکومت قائم ہو اس پر لازم ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا خود انتظام سنبھالے۔

اس فریضہ کے بارے میں یہی قاعدہ ہے جیسا کہ ذیل میں واضح ہوتا ہے:

(ا) امام رازی نے سورہ توبہ کی آیت ۶۰ کی تفسیر لکھتے ہوئے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا کام حکومت کے کرنے کا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اسی آیت میں عملہ کا حصہ مقرر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے لئے عملہ کی ضرورت ہے اور عملہ کو خود حکومت مقرر کرتی ہے۔

لہذا معلوم ہوا کہ حکومت ہی زکوٰۃ وصول کرے گی اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: "**خذ من اموالھم صدقة**" یعنی ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کریں۔

یہ کہنے کے لئے دوسری دلیل چاہئے کہ اموال باطنہ کا مالک خود بھی مستحق کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ "**وفی اموالھم حق للسائل والمحروم**"[۱۴] یعنی ان کے اموال میں مانگنے والے اور محروم لوگوں کا حق ہے۔ معلوم ہوا کہ جب یہ غریبوں کا حق ہے تو انہیں براہ راست دینا ضرور جائز ہے[۱۵]۔

(ب) مشہور حنفی محقق کمال الدین ابن ہمام نے کہا ہے کہ: "**خذ من اموالھم صدقة**" کے بظاہر معنی تو یہ ہیں کہ زکوٰۃ وصول کرنا یقیناً حکومت کا کام ہے یعنی اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں میں سے۔

اس پر حضور اور بعد کے دو خلفاء کے عہد میں عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ بعد میں جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا اور لوگوں میں تبدیلی آئی تو انہوں نے برا سمجھا کہ عملہ لوگوں کے خفیہ اموال کی چھان بین کرے اور یہ کام لوگوں کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ میری طرف سے آپ خود ادا کیا کریں اور ان کے اس عمل کے بارے میں ان سے کسی بھی صحابی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس سے حکومت کا حق یکسر ختم نہیں ہو جاتا چنانچہ جب معلوم ہو جائے کہ کوئی آبادی زکوٰۃ نہیں دے رہی تو حکومت اس سے مطالبہ کر سکتی ہے[۱۶]۔

(ج) جس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورﷺ ہر قسم کے ظاہرہ اور باطنہ اموال سے زکوٰۃ لیا کرتے تھے وہ ابو عبید کی روایت ہے جسے ترمذی اور دار قطنی نے نقل کیا ہے: ''حضورﷺ نے حضرت عمرؓ کو زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے بھیجا، وہ حضرت عباسؓ سے زکوٰۃ لینے کے لئے آئے تو حضرت عباسؓ نے کہا کہ میں تو دو سال پہلے ہی حضورﷺ کو پیشگی زکوٰۃ ادا کر چکا ہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ حضورﷺ کے پاس آئے اور بتایا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ سچے ہیں ہم نے ان سے دو سال کی زکوٰۃ پیشگی وصول کی ہوئی ہے''(۱۷)۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ حضرت عباسؓ تاجر تھے ان کا مال زرعی یا مویشیوں کی صورت میں نہیں تھا۔

(د) اس سے ملتی جلتی ایک حدیث بھی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ حضورﷺ نے اپنے عملہ کو تحصیل زکوٰۃ کے لئے روانہ کیا تو کچھ طعنہ زنوں نے کہا کہ ابن جمیل، خالد بن ولید اور عباس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے اس پر حضورؐ نے تقریر فرما دی اور عباس اور خالد کے بارے میں تو اس بات کی تردید فرما دی۔ تاہم ابن جمیل کے بارے میں تصدیق فرما دی اور یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ خالد پر زیادتی کر رہے ہیں، خالد نے تو اپنی زرہیں اور ہتھیار اللہ کی راہ میں وقف کئے ہوئے ہیں اور عباس پر دگنی زکوٰۃ عائد ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کی دگنی زکوٰۃ مجھ پر عائد ہے(۱۸)۔

(ھ) اس کی تائید ابو داؤد وغیرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ: ''حضورﷺ نے فرمایا مجھے چالیسواں دو، ہر چالیسواں روپیہ''(۱۹)۔ تو حضورﷺ کا یہ فرمانا کہ ''مجھے دو'' بتاتا ہے کہ یہ نقدی کی زکوٰۃ کا مطالبہ اور حکومت کو ادا کرنے کا حکم ہے۔

(و) کئی روایات میں آیا ہے کہ حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، ابن مسعود، معاویہ اور عمر بن عبدالعزیز رضوان اللہ اجمعین وغیرہ اپنے اپنے دور میں تنخواہوں میں سے زکوٰۃ لیا کرتے تھے۔ یعنی فوجیوں اور دیگر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں سے۔

حضرت ابوبکرؓ کا معمول تھا جب کسی کو تنخواہ دیتے تو پوچھتے کیا آپ کے پاس کوئی مال ہے؟ اگر وہ ہاں کہتا تو اس مال کی زکوٰۃ اسی تنخواہ میں سے کاٹ دیتے ورنہ تنخواہ ادا کر دیتے۔

حضرت ابن مسعودؓ کا معمول یہ تھا کہ مذکورہ ملازمین کی تنخواہوں میں سے ۲۵ روپے فی ہزار کے حساب سے زکوٰۃ کاٹتے کیوں کہ ان کے نزدیک سال کا گزرنا ضروری نہیں تھا۔

حضرت عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ جس وقت تنخواہوں کو بانٹتے اس وقت تاجروں کے مال کو جمع

کرتے اور موجود مال اور قرضوں کا حساب لگاتے اور موجود مال میں سے غائب مال کی زکوٰۃ وصول کرتے[۲۰]۔ حضرت قدامہ سے روایت ہے کہ میں جب حضرت عثمانؓ کی خدمت میں تنخواہ وصول کرنے کے لئے حاضر ہوتا تو وہ مجھ سے پوچھتے کیا آپ کے پاس ایسا مال ہے جس میں زکوٰۃ فرض ہو چکی ہو؟ تو اگر میں ہاں کہتا تو میری تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ وصول کرتے اور اگر میں نہیں کہتا تو میری تنخواہ مجھے دے دیتے تھے[۲۱]۔

(ز) نیز ابن عمر اور دیگر صحابہ سے یہ فتاویٰ بھی روایت کئے گئے ہیں کہ حکمران ظالم بھی ہوں تب بھی انہیں زکوٰۃ دینا فرض ہے اور ان فتووں میں ظاہرہ اور باطنہ کا فرق نہیں کیا گیا ہے۔

کچھ علماء نے اس دلیل کی بنیاد پر باطنہ اور ظاہرہ کا فرق رکھا ہوا ہے کہ عملی سنت کے طور پر کسی متواتر یا مشہور روایت سے یہ ثابت نہیں کہ حضورﷺ نے اپنے عملہ کو اس قسم کے مال سے زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا ہو جو نقدی یا اشیاء تجارت ہوں اور اس قسم کے مال سے کبھی انہوں نے زکوٰۃ وصول کی ہو اور اسے یا حضورﷺ کے پاس بھیجی ہو یا خود ہی آپؐ کی اجازت سے مستحقین میں بانٹی ہو۔ جیسا کہ وہ دیگر اموالِ ظاہرہ کے بارے میں کرتے تھے۔

اسی بناء پر بعض ائمہ کی یہ رائے ہے کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ حکومت کو دینا بھی جائز ہے اور خود مستحقین میں بانٹنا بھی جائز ہے بشرطیکہ خداخوفی کے ساتھ ہو اور صحیح مستحق لوگوں کو دی جائے کسی کی رعایت نہ برتی جائے۔

علاوہ بریں جب سنت سے ثابت ہوا کہ دونوں قسم کے مال میں فرق موجود ہے اور حضورﷺ کا اموال باطنہ میں سے زکوٰۃ لینے کے لئے عملہ نہ بھیجنے کی دو وجوہات تھیں:۔

۱۔ لوگ ایمان کے تقاضے کے تحت اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی خاطر زکوٰۃ کے فریضہ کی ادائیگی میں رغبت رکھتے ہوئے خود ہی زکوٰۃ لاتے تھے۔

۲۔ اس قسم کے مال کا تعین صرف صحابہ رسول کے لئے ہی ممکن تھا، اس کا فیصلہ اُن کے اسلام سے منور ضمیر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

حکومت اور گورنروں کے توسط سے اموال ظاہرہ اور باطنہ میں زکوٰۃ کی وصولی کا کام برابر جاری رہا، ہر چند کہ اموالِ ظاہرہ اور باطنہ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا طریقہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے طریقہ سے مختلف بھی رہا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کے دور میں حکومت کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے عشر کا نظام وضع کیا تھا جس کے تحت سرحدوں پر عشر وصول کرنے والے

بٹھائے گئے کہ وہاں سے کوئی تاجر گزرے تو اس سے مال تجارت کی زکوٰۃ وصول کی جائے۔

پھر حضرت عثمانؓ کے دور میں جب فتوحات کی وجہ سے بیت المال میں غنیمت، خراج، جزیہ، عشر اور زکوٰۃ کی مدات میں وافر مال آنا شروع ہوا تو حضرت عثمانؓ نے صرف اموالِ ظاہرہ میں سے ہی زکوٰۃ وصول کرنا مناسب سمجھا اور اموال باطنہ کی زکوٰۃ کا کام افراد کی اپنی ذمہ داری پر چھوڑ دیا کیوں کہ ایک تو انہیں لوگوں کی صداقت و دیانت پر اعتماد تھا دوسرا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آسانی ملے اور سرکاری اخراجات بھی کم ہو جائیں۔ یہ ان کا اپنا ذاتی اجتہاد تھا اگرچہ بعد میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر لوگوں نے اموال باطنہ کی زکوٰۃ دینا چھوڑ دی کیوں کہ ان کے ایمان اور دینداری میں کمزوری واقع ہوگئی۔ بعض علماء اس کی وضاحت میں یوں بھی کہتے ہیں کہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ نے اختیار دے دیا کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ آپ خود نکالیں اور میری طرف سے خود ہی تقسیم کریں۔ کاسانیؒ نے البدائع میں کہا ہے کہ حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اموال باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے مگر جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا اور بیت المال بھر گیا تو انہوں نے لوگوں کو خود اپنی ذمہ داری پر مستحقین میں زکوٰۃ تقسیم کرنے کے کام کو سپرد کیا اور تمام صحابہ اس پر راضی رہے یوں لوگ حکومت کے نائب بن گئے۔ آپؓ نے لوگوں سے کہا کہ جس پر کوئی قرضہ ہے وہ پہلے قرضہ ادا کرے اور جو مال بچے اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ البتہ اس طرح حکومت کا حق ختم نہیں ہو جاتا۔ اسی لئے ہمارے ائمہ کہتے ہیں کہ اگر حکومت کو کسی آبادی والوں کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ انہوں نے زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیا ہے تو حکومت ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے گی(۲۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل قانون تو یہ ہے کہ حکومت خود ہی زکوٰۃ وصول کرے۔ اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں صورتوں میں۔ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب بیت المال بھر گیا تو آپ نے لوگوں کو اپنی طرف سے اختیار دے دیا کہ تم خود ادا کرو۔ اس لئے جب لوگ کوتاہی کریں اور سپرد کی گئی ذمہ داری پوری نہ کریں تو حکومت خود یہ کام سنبھال لے جیسا کہ اصل قانون کا تقاضا ہے۔ جب اصل قانون یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنا حکومت کا حق ہے تو ہمارے موجودہ دور میں اموال باطنہ کی زکوٰۃ کون وصول کرے؟ اس مسئلے کو ہمارے بزرگ علماء عبدالوہاب خلاف، عبدالرحمٰن حسن اور محمد ابوزہرہ وغیرہ نے چھیڑا ہے اور زکوٰۃ کے بارے میں الجامعہ العربیہ دمشق کے زیرِ اہتمام ایک سیمینار منعقدہ ۱۹۵۲ء دمشق میں اس پر بحث کی ہے۔ ان علماء کا کہنا یہ ہے کہ آج کے حالات میں حکومت خود اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں میں سے زکوٰۃ وصول کرے، اس کی دو وجوہات ہیں:

-- اوّل یہ کہ لوگوں نے اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں قسم کے مال سے زکوٰۃ نکالنا چھوڑ دیا ہے اور اس طرح انہوں نے حضرت عثمانؓ اور بعد کے حکمرانوں کی طرف سے سپرد کردہ ذمہ داری پوری نہیں کی اور فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ حکومت کو اگر معلوم ہو جائے کہ کسی علاقے کے لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کر رہے ہیں تو ان سے زبردستی زکوٰۃ وصول کرے اور ظاہرہ و باطنہ کے درمیان اس بارے میں کوئی فرق نہیں۔

-- دوم یہ کہ اموال سارے کے سارے تقریباً ظاہرہ بن گئے ہیں کیوں کہ تجارتی اشیاء کے منافع کا ہر سال حساب لگایا جاتا ہے اور ہر چھوٹے بڑے تاجر کے پاس حسابات کا رجسٹر ہوتا ہے اس سے نفع اور نقصان کا اندازہ ہوتا ہے جن طریقوں سے منافع کا پتہ چلتا ہے انہی پر سرکاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ اور انہی کی بنیاد پر سالانہ مجموعی مالیت پر زکوٰۃ عائد کی جا سکتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ اور غریبوں کا حق ہے۔

نقدی وغیرہ تو اکثر و بیشتر بینکوں میں رہتی ہے اور یوں اس کو معلوم کرنا بہت آسان رہتا ہے اور جو لوگ اس کو زمین میں دبا کر رکھتے ہیں وہ درحقیقت زیادہ خوشحال اور دولت مند نہیں ہوتے، ان کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا ان کو اپنے حال اور اپنی ایمان داری پر چھوڑ دینا چاہئے۔

فقہاء نے حضرت عثمانؓ کے فیصلے کے تحت یوں فیصلہ دیا ہے کہ اموال باطنہ اگر ظاہرہ بن جائیں تو حکومت خود ان کی زکوٰۃ وصول کرے۔ اسی لئے تو حضرت عثمانؓ کے فیصلے پر عمل کرنے کے باوجود سرحدوں پر عشر وصول کرنے کا عمل جاری اور قائم رہا۔ کیوں کہ سرحد سے جب نقدی یا اشیاء تجارت لے کر کوئی گزرتا اس کی زکوٰۃ حکمران وصول کرتے کیوں کہ اس مال کو وہ باطنہ نہیں بلکہ ظاہرہ سمجھتے اور منتقلی کے وقت اس کی زکوٰۃ وصول کرتے۔ ہاں اگر مال والا یہ ثابت کرتا کہ وہ اس مال کی زکوٰۃ اسی سال کے اندر غریبوں کو یا حکومت کے دوسرے عملہ کو ادا کر چکا ہے تو اس سے دوبارہ نہ لی جاتی[۲۳]۔ یہ بات اتنی واضح اور مضبوط ہے کہ اس کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''فقہ الزکوٰۃ'' میں اسی کی تائید کی ہے۔

اس بناء پر میرا خیال ہے کہ موجودہ دور میں زکوٰۃ کے لئے کوئی بھی قانون بنایا جائے تو اس میں اموالِ ظاہرہ اور باطنہ دونوں کو شامل کیا جائے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں اکثر افزائشی مال واضح طور پر اموال باطنہ ہیں۔ اگر ہم نقدی اور اشیاء تجارت جیسے اموال باطنہ کی زکوٰۃ ایسے ممالک

میں جیسے خلیجی ممالک، سعودی عرب، عرب امارات، کویت، قطر اور بحرین ہیں، لیبیا چھوڑ دیں گے تو اس کے بعد زکوٰۃ کا دائرہ کتنا رہ جائے گا۔ صرف مویشی یعنی اونٹ، گائے اور بکریاں، زرعی اجناس اور پھل رہ جائیں گے جو کوئی قابل ذکر دولت نہیں اور نہ ان چیزوں سے اتنی زکوٰۃ نکل سکتی ہے جو زکوٰۃ سے متوقع بڑے بڑے اہداف کے حصول کے لئے کافی ہو۔ اگر زکوٰۃ کے دائرے اموال ظاہرہ تک محدود رکھیں تو جدہ، دوبئی یا ابوظہبی جیسے دولت مند شہروں سے محکمہ زکوٰۃ کو کس قدر زکوٰۃ مل سکتی ہے؟ یہاں نہ تو گائے اور بکریاں ہیں اور نہ ہی زراعت اور باغات ہیں۔ البتہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں ملین ریال یا دراہم شرائط زکوٰۃ پوری کرنے کے لئے موجود ہیں جو تجارت وغیرہ میں زیر استعمال ہیں اور یا بینکوں میں پڑے ہوئے ہیں تو ہم انہیں کیوں چھوڑیں اور اللہ تعالیٰ کا حق اس سے وصول نہ کریں جس سے ان کے دل اور مال بھی صاف ہوں۔ اسی طرح دولت مند تجارتی شہروں جیسے ریاض، کویت، دوحہ، منامہ، مسقط، قاہرہ اور اسکندریہ وغیرہ کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔

مگر میں اس میں حرج نہیں سمجھتا ہوں کہ ایک چوتھائی یا ایک تہائی کی نسبت سے عائد زکوٰۃ کا حصہ لوگوں کی صوابدید کے لئے چھوڑا جائے کہ وہ اسے خود اپنے جاننے والے اور عزیز و اقرباء اور پڑوسیوں میں تقسیم کریں۔اور اسے حضور ﷺ کے اس فرمان پر قیاس کیا جائے جو انہوں نے تخمینہ لگانے والے عمل کو جاری کیا تھا کہ ایک تہائی یا ایک چوتھائی کو مالک کی صوابدید کے لئے چھوڑ دیا جائے اس کی تشریح کچھ علماء نے یہ کی ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ اس حصے کی زکوٰۃ وہ مال والے خود تقسیم کر سکیں (۲۴)۔

سعودی عرب میں ایک سرکاری حکم جاری ہوا ہے جس کے مطابق بیت المال پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ سعودیوں سے نقدی اور اشیاء تجارت کی زکوٰۃ کا آدھا حصہ وصول کرے اور بقیہ نصف کو اس کے مالک خود اپنی صوابدید پر مستحقین میں تقسیم کریں اور اس کا حساب ان سے اللہ تعالیٰ لے گا۔ یہ حکم لوگوں کی خواہش کی بناء پر جاری کیا گیا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ زکوٰۃ کا کچھ حصہ وہ اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں اور جاننے والوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر میری رائے یہ ہے کہ:-

۱۔ افراد کی مرضی کے لئے ایک تہائی سے زیادہ نہ چھوڑا جائے۔ ایک تہائی کافی ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

۲۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی جائے مثلاً کہا جائے کہ جس کی زکوٰۃ کی ایک تہائی

ایک لاکھ ریال یا درہم سے بڑھ جائے یا مثلاً دس ہزار سے بڑھ جائے تو بقیہ ساری زکوٰۃ محکمہ زکوٰۃ کو دی جائے۔

۳۔ محکمہ زکوٰۃ کو حق حاصل ہو کہ اس وقت وہ عائد کل زکوٰۃ وصول کرے جب اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص وہ مقدار جو اس کی تقسیم کے لئے چھوڑ دی گئی ہے وہ اسے مستحقین کو ادا نہیں کر رہا ہے۔

انتظامیہ

نظامِ زکوٰۃ کی کامیابی کے لئے تیسری شرط بہتر انتظامیہ ہے کہ جو تحصیل وتقسیم کی نگرانی کرتی ہو کیوں کہ بہترین نظام بھی اگر بددیانت افراد کے ہاتھ میں ہو یا نااہل لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو اس کی بہتری برائی اور اس کی خوبی عیب میں تبدیل ہو جائے گی۔ کیوں کہ نظام اور اس کو چلانے والوں میں گہرا ربط رہتا ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ انصاف قانون کے الفاظ کی کتاب میں نہیں بلکہ جج اور قاضی کے دل میں ہوتا ہے۔

انتظامیہ کی بہتری چند چیزوں پر منحصر ہے جن میں بڑی دو ہیں: ایک تو یہ کہ محکمہ زکوٰۃ کے عملہ کا انتخاب بہترین ہو۔ دوم یہ کہ انتظامی اخراجات میں کمی و بیشی کا لحاظ رکھا جائے۔

ان میں ہر ایک چیز کی ہم الگ الگ وضاحت کرتے ہیں:-

بہتر عملے کا تقرر

بہتر عملے سے ہماری مراد یہ ہے کہ فقہاء نے عملہ کی تقرری کے لئے جو شرائط لگائی ہیں ان کو ملحوظ رکھا جائے اور وہ یہ ہیں کہ مسلمان ہو، کام کی اہلیت رکھتا ہو، کام کی سمجھ رکھتا ہو اور دیانت دار ہو۔ اسلامی پالیسی نے عام سرکاری ملازمت کے لئے جو شرائط رکھی ہیں وہ ساری ان دو میں شامل ہیں کہ ملازم میں صلاحیت اور دیانت داری دونوں موجود ہوں۔

اسی کی طرف قرآن کی اس آیت "ان خیر من استأجرت القوی الامین"[۲۵] میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض دفعہ دیانت داری کو حفاظت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح قوت کو علم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی قرآن کریم نے بیان کیا ہے: "اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم"[۲۶]. لیکن اگر قوت اور دیانت داری میں ترجیح کی صورت درپیش ہو جائے تو جہاد وغیرہ کے بارے میں طاقت کو اور مالیات کے بارے میں

دیانت داری کو ترجیح دی جائے گی۔

مالیاتی شعبوں میں ملازمت میں پاؤں پھسلنے کا امکان رہتا ہے اس میں ایسے کمزور ایمان اور اخلاق والے ثابت قدم نہیں رہ سکتے جن کی آنکھیں مال کی پہلی چمک کو دیکھ کر چندھیا جاتی ہوں۔ اس قسم کے لوگ زکوٰۃ سسٹم اور پورے اسلام کو غلط اور بری شکل میں پیش کرتے ہیں، اپنے برے رویئے کے سبب اسلامی احکامات کے نفاذ کے ثمرات سے عوام کو مایوس کر دیتے ہیں۔ لہذا زکوٰۃ کی تحصیل، تقسیم یا نگرانی کے لئے ملازمین کی تقرری میں پوری باریکی اور چھان بین سے کام لینا چاہئے اور بالخصوص محکمہ زکوٰۃ کے مرکزی عہدوں کے بارے میں تو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ دل کی مانند ہوتے ہیں یہ ٹھیک ہوں گے تو نیچے سب پرزے ٹھیک کام کریں گے اور یہ خراب ہوں گے تو نیچے بھی خرابی ہوگی۔ اس مقصد کے حصول میں زکوٰۃ کے محکمہ میں ایسے معروف دین دار اور بااخلاق رضاکاروں کی کچھ تعداد کو شامل کرنے سے مدد مل سکتی ہے جو یہ کام محض حصول ثواب اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے انجام دیں۔

زکوٰۃ ایک دینی فریضہ ہے اس کے محکمہ میں ملازمت کرنے والے کو چاہئے کہ اپنے کام کو عبادت اور جہاد سمجھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''زکوٰۃ کا کام درست طور پر کرنے والا فی سبیل اللہ غازی کی مانند رہتا ہے یہاں تک کہ وہ گھر لوٹے''(۲۷)۔ ضروری ہے کہ ملازم انصاف پسند ہو نہ تو وہ کسی کی رعایت کرے اور نہ کسی سے زیادتی کرے وہ خوشی اور ناراضگی ہر حال میں درست کام کرے نہ دولت مندوں کی پروا کرے اور نہ غریبوں کی فکر کرے۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا خیال رکھے۔

ایسے بلند صفت لوگوں میں سے ایک مثال وہ ہے جو محدثین اور مورخین نے عبداللہ بن رواحہ انصاری کے بارے میں نقل کی ہے جب حضور ﷺ نے انہیں خیبر کے باغات کے تخمینے کے لئے روانہ کیا (کیوں کہ حضور ﷺ نے یہودیوں کو نصف پیداوار کے عوض اپنے باغات اور اراضی پر چھوڑ دیا تھا) جب عبداللہ ان کے پاس آئے تو یہودیوں نے اپنی عورتوں کے زیورات میں سے کچھ زیورات اکٹھے کر کے ہدیہ کے طور پر پیش کئے کیوں کہ یہودی سرکاری عہدیداروں کو مال یا دیگر خواہشات کے عوض خریدا کرتے تھے مگر ابن رواحہ نے ایمانی قوت سے ان کا سامنا کرتے ہوئے کہا یہودیو! خدا کی قسم مجھے تم تمام لوگوں سے زیادہ برے لگتے ہو لیکن یہ بات مجھے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تم پر زیادتی کروں اور تم نے مجھے جو رشوت پیش کی یہ حرام ہے اور ہم اسے نہیں

کھاتے۔ پھر انہوں نے باغات کا تخمینہ لگایا اور ان کو اختیار دیا کہ اب تم دونوں میں سے جو چاہو پسند کرلو اس پر یہودیوں نے کہا اسی انصاف پر آسمان و زمین قائم ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ابن رواحہ نے ان سے کہا خدا کی قسم تم سے زیادہ جھگڑالو اور رسول اللہ ﷺ سے عداوت کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ خدا کی قسم! تم سے زیادہ مبغوض میرے لئے خدا نے کسی کو پیدا نہیں کیا۔ خدا کی قسم اس کے باوجود میں جان بوجھ کر تمہارے ساتھ ذرہ برابر زیادتی کرنے پر آمادہ نہ ہوں گا۔ ایسے واضح اور روشن الفاظ کے بعد ابن رواحہ نے پھلوں کا تخمینہ لگایا کہ اتنا حصہ مسلمانوں کا اور اتنا یہودیوں کا ہوگا جو مجموعی طور پر اَسّی ہزار وَسَق بنتا تھا۔ یہودیوں نے کہا کہ تم نے تخمینہ زیادہ لگایا تو ابن رواحہ نے کہا تم چاہو تو ہمیں چالیس ہزار وَسَق دے دو اور ہم دست بردار ہو جاتے ہیں اور چاہو تو ہم تمہیں چالیس ہزار وسق دیتے ہیں اور تم دست بردار ہو جاؤ تو یہودوی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور کہا اس انصاف پر آسمان و زمین قائم ہیں اور اسی سے یہ لوگ تم پر غلبہ پائیں گے۔ محکمہ زکوٰۃ کے ملازم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال سے اپنا ہاتھ اور نگاہ دور رکھے کیوں کہ یہ غریبوں اور مستحقین کا حق ہے اس کے لئے صرف کام کا معاوضہ جائز ہے اس کے علاوہ جس کے منہ میں پانی آتا ہو اور زکوٰۃ کے مال میں سے لیتا ہو۔ وہ درحقیقت غریبوں کا حق مارتا ہے بلکہ پیٹ میں آگ بھرتا ہے۔ حضورؐ نے بڑی سختی سے زکوٰۃ کے عملہ کو عذاب سے ڈرایا ہے۔ چنانچہ عدی بن عمیرہ سے روایت ہے کہ میں نے حضورؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس کسی کو ہم زکوٰۃ کے کام پر لگائیں اور وہ ہم سے ایک سوئی یا اس سے بھی کم چھپا لے تو وہ خیانت ہوگی اور قیامت کے روز اسے وہ لانی ہوگی(۲۸)۔

عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ حضورؐ نے زکوٰۃ کے لئے بھیجا اور فرمایا: ابوالولید! اللہ سے ڈر کہیں قیامت والے دن بڑبڑانے والا اونٹ، ہاں ہاں کرنے والی گائے یا میں میں کرنے والی بکری کو اٹھا کر آنے والا نہ بنے تو میں نے کہا یا رسول اللہ یہ ایسا ہی ہوگا تو فرمایا کہ ہاں یقیناً خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا''(۲۹)۔

حضور ﷺ نے تو زکوٰۃ اہل کار کے لئے ہدیہ لینا بھی ناجائز قرار دیا ہے کیوں کہ بسا اوقات یہ رشوت کے طور پر دی جاتی ہے اس لئے حضور ﷺ نے ایک اہل کار کو بہت سختی سے ڈانٹا جب اس نے کوئی چیز اپنے لئے الگ کر دی اور کہا کہ یہ مجھے تحفہ کے طور پر دی گئی ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے تقریر فرمائی اور کہا کہ یہ شخص اگر سچا ہے تو اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھ کر اس کو تحفہ کیوں نہ ملا۔ خدا کی قسم تم میں سے جو کوئی بھی ناحق کوئی چیز لے گا قیامت کے روز اسی چیز کو اٹھا کر اللہ کے

سامنے پیش ہوگا''(۳۰)۔

اسی بنیاد پر امام ابویوسفؒ نے ہارون رشید بادشاہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ نظامِ زکوٰۃ کے اہل کاروں کی تقرری میں احتیاط برتی جائے اور اپنی کتاب ''الخراج'' میں یہ لکھا کہ امیرالمومنین! کسی دیانت دار، پاکباز، تمہارے لئے اور ملکی عوام کے لئے خیر خواہ اور بے ضرر شخص کو منتخب کر کے زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے ذمہ دار بنائیں اس کو یہ ہدایت کر دیں کہ وہ آگے ایسے افراد کو ذمہ دار بنائے جن کے دین، اطوار اور دیانت داری کے بارے میں اطمینان حاصل کر لے۔ زکوٰۃ کا کام خراج کے اہل کاروں کے سپرد نہ کریں، زکوٰۃ کا مال خراج کے مال میں نہیں ملنا چاہئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ خراج کے اہل کار اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو زکوٰۃ اکٹھی کرنے کے لئے بھیجتے ہیں جو ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور ناجائز و نامناسب کام کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کے لئے پاکباز اور نیک لوگوں کو مقرر کرنا چاہئے۔ جب آپ کسی کو منتخب کریں اور آگے وہ دوسرے ایسے لوگوں کو کام تفویض کر دے جن کی امانت و دیانت، قابل اعتماد ہو تو پھر اپنی صوابدید کے مطابق ان کی تنخواہ مقرر کریں اور تنخواہیں اتنی نہ ہوں کہ زکوٰۃ کی رقوم پر حاوی ہو جائیں۔ یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ خراج کا مال زکوٰۃ وعشر کے مال میں ملایا جائے کیوں کہ خراج کا مال تمام مسلمانوں کا حق ہے اور زکوٰۃ صرف قرآن میں بتائے گئے لوگوں کا حق ہے(۳۱)۔

امام ابو یوسفؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''امیرالمومنین! زکوٰۃ اہل کاروں کو ہدایت کر دیں کہ وہ صرف مقررہ زکوٰۃ وصول کریں اور آگے صرف حق دار کو دیں اور حضور ﷺ اور آپ کے خلفاء کی سنت کے مطابق کام کریں اور جان لو امیرالمومنین! کہ جس نے اچھی مثال قائم کی اس کو اپنے عمل اور جو بھی اس پر عمل کرے گا اس کے عمل کا ثواب ملے گا اور عمل کرنے والے کے ثواب میں اس سے کمی نہیں آئے گی اور جو بری مثال قائم کرے گا اس کا وبال اور جو بھی اس پر عمل کرے گا اس کے عمل کا وبال بھی اس پر پڑے گا اور عمل کرنے والے کے وبال میں اس سے کمی نہیں آئے گی(۳۲)۔

اخراجات میں سادگی اور کفایت شعاری

جس بہتر انتظام کو ہم ضروری قرار دیتے ہیں اس میں انتظامی اخراجات میں ہر ممکن کفایت شعاری اور سادگی بھی شامل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ظاہری اور نمائشی تکلفات سے اجتناب برتا جائے اور اخراجات میں کمی کی کوشش کی جائے کیوں کہ اس طرح مقصد کا حصول جلد اور کم خرچ کے

ساتھ ہو سکے گا۔

مقامی اہل کاروں کی تقرری

جن چیزوں سے اخراجات میں کمی ہوسکتی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہر آبادی میں سے زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے مقامی اہل کاروں کو بھرتی کیا جائے بجائے اس کے کہ بیرونی لوگوں کو بھاری تنخواہ کے عوض بھرتی کیا جائے اور محکمہ زکوٰۃ پر بوجھ ڈالا جائے۔ مقامی لوگ اپنے گھروں میں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہیں گے اور اس طرح دوسروں کی نسبت کم تنخواہ پر راضی ہوں گے۔ نیز کچھ مقامی اساتذہ، کلرک، اکاؤنٹنٹ وغیرہ سے محکمہ زکوٰۃ میں پچھلے ٹائم معمولی اضافی معاوضے کے ساتھ مدد لی جا سکتی ہے بجائے اس کے کہ ہمہ وقتی ملازم رکھے جائیں۔

رضا کاروں کی بھرتی

اخراجات کو کم کرنے کے لئے یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ جو دیندار لوگ خوشی سے ثواب کے لئے کام کرنا چاہیں انہیں بھرتی کر لیا جائے۔ اس سے اور فائدے بھی حاصل ہوں گے۔ چوں کہ ان لوگوں کو کام کا شوق ہوتا ہے لہذا یہ ہر طرح کی مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ رکاوٹ ڈالنے والوں یا ذاتی اغراض کے لئے استعمال ہونے والوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ لوگ جب محض ثواب کی خاطر بلامعاوضہ اپنی خدمات پیش کریں گے تو یہ ایک طرف محکمہ زکوٰۃ کو تقویت دینے اور دوسری طرف سے عمدہ نتائج پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

اجناس کے بجائے قیمت کی وصولی

وصولی کے کام میں یہ بھی ضرور آسانی ہوگی کہ جنس کے بجائے اس کی قیمت وصول کی جائے۔ فقہاء کی اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔ کچھ تو اس کو ناجائز سمجھتے ہیں اور کچھ بلا کراہت اسے جائز قرار دیتے ہیں اور کچھ کراہت کے ساتھ اسے جائز ٹھہراتے ہیں اور کچھ بعض صورتوں میں جائز اور بعض میں ناجائز سمجھتے ہیں۔ قیمت کی وصولی کی مخالفت میں زیادہ سخت شافعی اور ظاہری علماء ہیں جبکہ ان کے مقابلہ میں حنفی علماء اسے ہر حال میں جائز ٹھہراتے ہیں۔ مالکی اور حنبلی علماء کی آراء میں اس بارے میں کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مختصر خلیل میں لکھا ہوا ہے کہ قیمت ادا کرنا جائز نہیں۔ ابن حاجب اور ابن بشیر نے بھی ان کی پیروی میں یہی بات کہی ہے۔

التوضیح میں بالتصریح یہ کہا گیا ہے کہ یہ المدونۃ کے برخلاف ہے۔ اس بارے میں ان کی یہ

بات مشہور ہے کہ قیمت ادا کرنا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے(۳۳)۔ ابن ناجی کی شرح الرسالۃ(۳۴) میں لکھا ہوا ہے کہ اشہب اور ابن القاسم کہتے ہیں کہ قیمت ادا کرنا مطلقاً جائز ہے اور کچھ علماء کا کہنا اس کے برعکس ہے۔ المدونۃ میں لکھا ہوا ہے کہ جس کو زکوٰۃ وصول کرنے والا اہل کار قیمت ادا کرنے پر مجبور کرے تو امید ہے کہ یہ کافی ہوگا۔

شیوخ کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وصول کرنے والا حاکم ہوتا ہے اور حاکم کا فیصلہ اختلاف کو ختم کر دیتا ہے(۳۵)۔

حنابلہ میں سے المغنی میں لکھا ہوا ہے کہ امام احمدؒ کے مشہور مذہب کے مطابق کسی بھی چیز کی زکوٰۃ اس کی قیمت کی صورت میں ادا کرنا جائز نہیں۔ یعنی نہ صدقہ فطر کی اور نہ مال کی زکوٰۃ کی کیوں کہ ایسا سنت کے خلاف ہے۔ امام احمدؒ سے ایک روایت کے مطابق صدقہ فطر کے سوا کسی بھی مال کی زکوٰۃ اس کی قیمت کی صورت میں ادا کرنا جائز ہے(۳۶)۔

اس اختلاف کا پہلا سبب زکوٰۃ کی حقیقت کے بارے میں زاویہ ہائے نظر کا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ کیا زکوٰۃ کی حیثیت عبادت اور قربت خداوندی کی ہے یا یہ دولت مندوں کے مال میں غریبوں کے حق کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا یہ ہمارے الفاظ میں نصاب کے مالک شخص پر مالیاتی ٹیکس کی حیثیت رکھتی ہے۔

درحقیقت زکوٰۃ ان دونوں مطالب پر مشتمل ہے مگر شافعی، مشہور روایت کے مطابق احمد، بعض مالکی علماء اور ظاہریہ علماء نے زکوٰۃ کے عبادت اور قربت والے مفہوم کو زیادہ فوقیت دی ہے اور کہا ہے کہ جس چیز کا ذکر شریعت میں ہوا ہے اسی چیز کو بعینہ زکوٰۃ میں دیا جائے اور اس کی قیمت دینا جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ ان کے شاگردوں اور دوسری جانب کے دیگر ائمہ نے اس چیز کو فوقیت دی ہے کہ زکوٰۃ ایک مالی حق ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ غریبوں کی ضروریات پوری ہوں لہذا ان کے نزدیک قیمت ادا کرنا جائز ہے۔ دونوں طرف کے علماء کے پاس اس قدر دلائل موجود ہیں کہ اس موقع پر ان کو بیان کرنا مشکل ہے، صرف اشارہ کرنا ہی کافی ہوگا(۳۷)۔

قیمت کی ادائیگی کو جائز نہ سمجھنے والوں کے دلائل

(ا) زکوٰۃ دینا تو اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کرنے والا کام ہے۔ ایسے کام میں ضروری ہے کہ اللہ تعالی کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ جیسا کہ نماز میں ناک اور پیشانی کے بجائے رخسار اور ٹھوڑی کو زمین پر رکھنا سجدہ کرنے کی جگہ نہیں لے سکتا اسی طرح بکری یا اونٹ کے بجائے اس کی قیمت کی ادائیگی

سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوسکتی۔

(ب)دوسرا مطلب یہ ہے کہ غریب کی ضرورت پوری کرنے اور نعمت کے شکر ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ اور چونکہ ضروریات تو گوناگوں ہوتی ہیں لہذا زکوٰۃ بھی گوناگوں صورت میں ہونی چاہئے۔

(ج) اس کے علاوہ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ حضورﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن کے لئے روانہ کیا تو ہدایت فرمائی کہ غلہ میں سے غلہ لو، بکریوں میں سے بکری لو اور اونٹوں میں سے اونٹ لو اور گایوں میں سے گائے لو[۳۸]۔ یہ نص یعنی واضح الفاظ ہیں اس لئے اس حد تک محدود رہنا ضروری ہے اور قیمت لینا جائز نہیں، جن حنفی اور دیگر علماء نے قیمت کی ادائیگی کو جائز قرار دیا ہے ان کے دلائل یہ ہیں:-

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "خذ من اموالهم صدقة" ان الفاظ سے واضح ہے کہ مال وصول کیا جائے اور قیمت مال ہی ہے اور مال سے مشابہت رکھتی ہے۔ قرآن کریم کی جو تشریح حضورؐ نے فرمائی ہے کہ ہر چالیس میں سے ایک بکری لو تو وہ صرف مال والوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ جو چیز فرض ہے وہی دی جائے، اس لئے کہ مویشی والے لوگوں کے پاس نقدی کم ہی ہوا کرتی ہے اور مویشی کی ادائیگی ان کے لئے آسان ہوتی ہے[۳۹]۔

۲۔ بیہقی نے اپنی سند اور بخاری نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ معاذ نے یمن میں لوگوں سے کہا کہ مجھے زکوٰۃ کے بجائے چادر یا کپڑے لا دو کیوں کہ یہ تمہارے لئے آسان اور مدینے کے مہاجرین کے لئے بہتر ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ مجھے مکئی اور جو کے بجائے کپڑے لا دو[۴۰]۔

۳۔ احمد اور بیہقی کی روایت ہے کہ ایک اہل کار نے مویشیوں کی زکوٰۃ کے ضمن میں دو اونٹوں کے بجائے ایک اونٹنی وصول کی اور ایسا کرنا قیمت کے لحاظ سے ہو سکتا ہے۔

۴۔ زکوٰۃ کا مقصد غریب کی ضرورت پوری کرنا ہوتا ہے یہ بکری سے جس طرح پورا ہوتا ہے قیمت سے بھی اسی طرح پورا ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات قیمت کی صورت میں یہ مقصد پورا ہونا زیادہ آسان اور واضح ہوتا ہے۔ ضروریات کتنی بھی گوناگوں کیوں نہ ہوں قیمت سے پوری کی جا سکتی ہیں۔

۵۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں عطاء سے روایت کیا ہے کہ عمرؓ دراہم کی زکوٰۃ میں اشیاء لیا کرتے تھے[۴۱]۔

مجھے یقین ہے کہ مذکورہ بالا دونوں جانب کے دلائل میں غور کرنے سے ہمیں یہ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے میں حنفی فقہاء کا مذہب زیادہ وزنی ہے۔ روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں اور فکر و نظر بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کے پہلو کو فوقیت دینا اور نماز پر اس کو قیاس کرنا زکوٰۃ کی فطرت سے ہم آہنگ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفی علماء کے مخالفین نے خود بھی یہ کہا ہے کہ یہ ایک مالی حق اور امتیازی عبادت ہے اور اسی بناء پر نابالغ اور دیوانے کے مال میں بھی انہوں نے زکوٰۃ فرض کر دی ہے حالانکہ نماز دونوں کو معاف ہے۔ ان کو چاہئے کہ جیسا یہاں کہتے ہیں ویسے وہاں بھی کہیں۔ اور ان احناف کی تردید کریں جنہوں نے غیر مکلّف کو نماز پر قیاس کر کے زکوٰۃ سے معاف قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ احناف کی رائے ہمارے زمانے سے زیادہ مطابق ہے اور لوگوں کے لئے اور حساب کے لئے بہت آسان ہے بالخصوص جب زکوٰۃ کا محکمہ بھی موجود ہو کیوں کہ جنس کی صورت میں وصولی میں زیادہ اخراجات آئیں گے کیوں کہ اشیاء کو بیت المال تک پہنچانا ہوگا وہاں چوکیدار رکھنا ہوگا، ضائع ہونے سے بچانا ہوگا مویشیوں کے لئے باڑا، گھاس، چارہ اور پانی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اس طرح کافی محنت اور مشقت اٹھانی ہوگی جو انتظامی اخراجات میں کفایت شعاری کرنے کے خلاف پڑتا ہے۔ یہ رائے عمر بن عبدالعزیز، حسن بصری، سفیان ثوری سے بھی منقول ہے اور امام احمدؒ کی ایک رائے صدقہ فطر کے علاوہ بھی اسی طرح کی منقول ہے[۴۲]۔

امام نوویؒ نے کہا ہے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں یہی رائے اپنائی ہے[۴۳]۔ ابن رشید کا کہنا ہے کہ امام بخاری نے حنفیت سے نہایت مخالفت کے باوجود ان کی اس رائے سے موافقت کی ہے کیوں کہ دلائل نے انہیں مجبور کیا ہے[۴۴]۔ امام ابن تیمیہ نے دونوں کے درمیان ایک تیسری صورت اپنائی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس میں زیادہ نمایاں چیز یہ نظر آتی ہے کہ بلا ضرورت اور معقول فائدے کے بغیر تو قیمت کی ادائیگی ممنوع ہے یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے اوقاص کا تخمینہ دو بکریوں یا بیس درہم سے لگایا اور قیمت کی طرف مائل نہ ہوئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ہم کلی طور پر قیمت کو جائز قرار دیں گے تو ممکن ہے کہ مالک ردی قسم کی طرف پلٹ جائے اور قیمت لگانے میں نقصان بھی ہو سکتا ہے اور زکوٰۃ کا مقصد غم گساری اور ہمدردی بھی ہے جو جنس اور مقدار میں سمجھی جاتی ہے۔ البتہ ضرورت، فائدہ یا پھر جانے کے تحت قیمت دینے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے کوئی باغ کا پھل یا کھیتی کی فصل دراہم سے فروخت کرے تو ایسی

صورت میں دراہم میں سے عشر ادا کرنے سے فرض ادا ہو جائے گا۔ اسے مجبور نہیں کیا جائے گا کہ دراہم سے گندم یا پھل خرید کر دو۔ کیوں کہ اس نے غریبوں کو اپنے برابر کر دیا ہے۔ امام احمدؒ نے اس کے جواز کا فتویٰ بھی دیا ہے۔ یا مثلاً کسی پر پانچ اونٹوں کی زکوٰۃ میں ایک بکری عائد ہو جائے اور وہاں ایسا کوئی نہ ہو جو اسے بکری فروخت کرے تو اس کے لئے قیمت ادا کرنا جائز ہوگا۔ اسے یہ تکلیف نہیں دی جائے گی کہ دوسری آبادی سے جا کر بکری خرید لاؤ۔ یا مثلاً مستحقین کا تقاضا ہو کہ ہمیں قیمت دیں کیوں کہ یہ ہمارے لئے مفید ہے اور انہیں قیمت دی جائے یا اہل کار کو خیال آئے کہ غریبوں کے لئے قیمت زیادہ موزوں ہے جیسے کہ روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل یمن والوں سے کہا کرتے تھے کہ مجھے چادریں اور کپڑے لا دو۔ یہ تمہارے لئے بھی آسان ہے اور مدینہ کے مہاجرین اور انصار کے لئے بھی زیادہ سودمند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقولہ زکوٰۃ کے بارے میں تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جزیہ کے بارے میں تھا[۴۵]۔

یہ ہماری رائے سے قریب تر ہے۔ ہمارے زمانے کی ضرورتیں اور مفادات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ غریبوں یا دولت مند زکوٰۃ دہندگان کے لئے اگر نقصان دہ نہ ہو تو قیمت کی ادائیگی جائز قرار دی جائے۔

بہتر نظامِ تقسیم

انسانی اور معاشرتی اہداف کے حصول میں نظام زکوٰۃ کی کامیابی کے لئے تیسری شرط بہتر نظامِ تقسیم اور درست بنیادوں پر اس کا قیام ہے تاکہ کوئی بھی مستحق اس سے محروم نہ رہے اور غیر مستحق یہ وصول نہ کر پائے یا مستحق کو ضرورت سے کم نہ ملے اور یا نسبتاً اچھے حالات والے کو ملے اور زیادہ ضرورت مند محروم رہ جائے۔ اسلام نے جن بنیادوں کی طرف رہنمائی کی ہے ان کی کچھ مثالیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

اول: مقامی طور پر تقسیم

مطلب یہ ہے کہ ہر علاقے کے مستحقین کو باہر والے علاقے کے مستحقین پر ترجیح دی جائے جیسا کہ غیر مرکزی یا مقامی محکمہ جات والے نظام میں کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت ہر قصبے یا قصبوں کے مجموعے کے مستحقین اس زکوٰۃ کے زیادہ حق دار ہیں جو اسی علاقے میں دولت مندوں سے مرکزی محکمہ زکوٰۃ کی ذیلی شاخوں کے ذریعے اکٹھی ہو۔ اور ان سے جو باقی بچے تو قریب ترین قصبوں والے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اور یہ اس علاقے میں مرکزی زکوٰۃ دفتر کی شاخوں کے توسط سے ہو۔ اور اس

مرکز کی ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی اگر کچھ بچے تو پھر اسے ضلعی سطح کے زکوٰۃ مرکز کو منتقل کیا جائے۔ یہ مصر کی انتظامی تقسیم کے مطابق ہے دیگر اسلامی ممالک میں بھی چھوٹے یونٹوں سے شروع کیا جائے اور اوپر کی طرف منتقل ہوتا رہے۔ کسی پورے صوبے کی ضرورت سے بھی جو فاضل ہو اسے مرکزی محکمہ زکوٰۃ کو منتقل کیا جائے تاکہ اس سے دیگر ایسے صوبہ جات کی مدد کی جائے جہاں زکوٰۃ کی وصولی کم ہو یا دوسروں کی نسبت اس صوبہ میں غریبوں اور ضرورت مندوں کی تعداد زیادہ ہو۔ تاکہ اس سے مسلمانوں کے مفاد والے بڑے منصوبے قائم کئے جا سکیں جبکہ اکیلا کوئی بھی صوبہ ایسے منصوبوں کو قائم کرنے سے قاصر ہو۔

زکوٰۃ کی آمدنی کو خرچ کرنے کے بارے میں اسلام کی تعلیمات یہ ہیں اور یہی اس کی منصفانہ اور حکیمانہ پالیسی ہے جو آج کل کی جدید ترقی یافتہ انتظامی، سیاسی اور مالیاتی پالیسی کے عین مطابق ہے۔

اسلام کے پیش کردہ نظام کی قدر و قیمت ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اس کا موازنہ ایرانی، رومی اور دنیا کے دیگر ان نظاموں سے نہ کریں جو اسلام سے پہلے موجود تھے۔

جاہلی دور اور یورپ وغیرہ کے تاریک ادوار میں جس طرح ٹیکس اور محصولات جن کاشتکاروں، صنعت سازوں، پیشہ وروں اور چھوٹے تاجران وغیرہ سے وصول کئے جاتے تھے، لوگ اس سے واقف تھے کہ یہ ٹیکس محنت کشوں کے بازوؤں کے زور، پیشانی کے پسینے، راتوں کی بیداری اور دنوں کی تھکاوٹ سے حاصل ہونے والی کمائی میں سے وصول کئے جاتے رہے۔ خون، پسینے اور آنسوؤں پر مشتمل یہ پیسے بادشاہوں اور سرداروں کے پاس دارالحکومت میں جاتے جو انہیں اپنے تخت کی سجاوٹ، زیبائشی کاموں اور اپنے ملازمین اور پہرے داروں وغیرہ پر خرچ کرتے۔ اگر اس میں سے کچھ بچتا تو اس سے دارلحکومت کی توسیع و تزئین اور رہنے والوں کو خوش رکھنے کا کام لیا جاتا پھر اس سے بھی اگر کچھ بچتا تو اپنے قریبی قصبات پر خرچ کیا جاتا۔ اس سارے عمل میں یہ لوگ ان پریشان حال اور درماندہ اور دور و دراز قصبوں سے غافل رہتے جہاں سے یہ پیسے اکٹھے کئے جاتے رہے۔ اسلام آیا تو اس نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ زکوٰۃ ادا کریں اور حکمرانوں سے کہا کہ وصول کرو اور یہ پالیسی بنائی کہ جہاں سے زکوٰۃ اکٹھی ہو وہیں پر تقسیم بھی ہو۔

مویشیوں، غلہ جات اور پھلوں کے بارے میں بالاتفاق یہی حکم ہے کہ جہاں سے اکٹھے کئے جائیں وہیں تقسیم بھی ہوں۔ اس پر بھی اتفاق پایا جاتا ہے کہ صدقہ فطر اسی علاقے میں تقسیم کیا جائے

جہاں سے ادا ہو۔ البتہ نقدی وغیرہ کی زکوٰۃ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا زکوٰۃ جہاں سے وصول ہو وہیں تقسیم بھی ہو[۴۶]۔ لیکن اکثریت کے نزدیک زیادہ معروف یہ ہے کہ مال کی جگہ کو ملحوظ رکھا جائے نہ کہ مالک کی[۴۷]۔

اس پالیسی کی دلیل حضور ﷺ اور خلفاء راشدین کی سنت ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ جب اپنے اہل کاروں کو صوبوں اور علاقوں میں زکوٰۃ کی وصولی کے لئے بھیجتے تو انہیں حکم دیتے کہ آبادی کے دولت مندوں سے وصول کر کے وہیں کے غریبوں میں بانٹ دیں۔

حضرت معاذؓ کی ایک صحیح روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں یمن بھیجا اور حکم دیا کہ وہاں کے دولت مندوں سے لے کر وہیں کے غریبوں میں بانٹ دے۔ بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ اگر مستحق موجود ہوں تو وہاں سے اکٹھی کی جانے والی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں۔ بلکہ ہر علاقے کی زکوٰۃ پر اسی علاقے کے مستحقین کا حق ہے۔

حضرت معاذؓ نے حضور ﷺ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یمن والوں کی زکوٰۃ وہاں کے مستحقین میں بانٹ دی بلکہ ہر علاقے کی زکوٰۃ اسی علاقے کے ضرورت مندوں میں بانٹ دی اور اس بارے میں ایک مکتوب لکھا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جو اپنے آبائی ضلع سے دوسرے ضلع میں منتقل ہوگا اس کی زکوٰۃ اور عشر اس کے آبائی ضلع میں تقسیم ہوگی[۴۸]۔

ابوجحیفہ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس حضور ﷺ کا تحصیلدار زکوٰۃ آیا تو اس نے ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ وصول کر کے ہمارے ضرورت مندوں میں بانٹ دی۔ میں اس وقت ایک یتیم لڑکا تھا تو مجھے اس میں سے ایک اونٹنی دی[۴۹]۔

ایک صحیح حدیث ہے کہ ایک دیہاتی نے حضور ﷺ سے کئی سوالات پوچھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ آپ کو اس اللہ کا واسطہ جس نے آپ کو رسول بنایا کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ وصول کرو اور ہمارے غریبوں میں بانٹ دو تو حضورؐ نے جواب دیا کہ ہاں!

ابوعبید نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وصیت میں کہا کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو یہ اور یہ وصیت کرتا ہوں اور وصیت کرتا ہوں کہ دیہاتیوں سے اچھا سلوک کریں کیوں کہ یہی اصل عرب اور اسلام کا بیج ہیں اور ان کا فاضل مال لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کریں[۵۰]۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں یوں ہوتا رہا کہ جہاں سے مال اکٹھا ہوتا وہیں تقسیم ہوتا اور تحصیل زکوٰۃ کے اہل کار خالی ہاتھ مدینہ واپس لوٹتے۔ ان کے پاس صرف اپنے کمبل اور اپنی کھونٹیاں ہوتیں۔ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ دیہاتیوں سے وصول کردہ زکوٰۃ کو کیا کریں تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں انہیں زکوٰۃ ضرور لوٹا دوں گا۔ یہاں تک کہ ایک شخص کو سو اونٹنیاں یا اونٹ مل جائیں[۵۱]۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ کو دوسری جگہ منتقل کرنا اس جگہ کے غریبوں کی ضرورتوں کے باوجود اس مقصد اور حکمت کے خلاف ہے جس کے حصول کے لئے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ اسی لئے المغنی میں کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد غریبوں کی ضروریات پوری کرنا ہے اگر ہم ایک جگہ سے زکوٰۃ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کو جائز قرار دیں گے تو اس کے نتیجے میں اس جگہ کے غریبوں کی ضرورتیں باقی رہ جائیں گی[۵۲]۔ حضورﷺ اور خلفاء راشدین کے طریقے پر بعد کے عادل حکمراں بھی عمل پیرا رہے اور صحابہ و تابعین کے فتویٰ دینے والے فقہاء اور ائمہ بھی۔ چنانچہ عمران بن حصین کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے بنی امیہ کے دور میں زیاد یا کسی اور حاکم کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے کسی اہل کار کو مقرر کیا جب وہ شخص واپس آیا تو اس سے پوچھا مال کہاں ہے؟ اس نے کہا کیا آپ نے مجھے مال کے لئے بھیجا تھا؟ ہم نے تو وہاں سے وصول کیا جہاں سے ہم حضورﷺ کے زمانے میں وصول کرتے تھے اور وہاں لگا دیا جہاں ہم حضورﷺ کے زمانے میں لگاتے تھے[۵۳]۔

محمد بن یوسف ثقفی نے یمن کے فقیہ حضرت طاؤس کو کسی ضلعے کی زکوٰۃ کا کام سپرد کیا تو وہ وہاں کے امیروں سے لے کر وہاں کے غریبوں میں بانٹتا رہا۔ جب فارغ ہوا تو اس کو کہا حساب دو تو اس نے کہا میرے پاس کوئی حساب نہیں میں تو امیر سے لیتا رہا اور غریب کو دیتا رہا[۵۴]۔

فرقد سنجی سے روایت ہے کہ میں اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر مکہ میں بانٹنے کے لئے گیا وہاں میں سعید بن جبیر سے ملا تو انہوں نے کہا اسے واپس لے جا کر اپنے شہر کے غریبوں میں بانٹ دو۔ سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ رئ سے زکوٰۃ کوفہ منتقل کی گئی تو عمر بن عبدالعزیز نے وہ واپس رئ میں بھیج دی۔

ابو عبید نے کہا ہے کہ آج تمام علماء کا ان تمام روایات پر اتفاق ہے کہ ہر آبادی یا ہر چراگاہ یعنی دیہات کے رہنے والے لوگ اس وقت تک اپنے علاقے کی زکوٰۃ کے اوّلین حق دار ہیں۔ جب

تک اس آبادی میں ایک بھی ضرورت مند موجود ہو چاہے وہ اس پوری زکوٰۃ کو ہی کیوں نہ لے اور زکوٰۃ کا عملہ وہاں سے کچھ بھی نہ لے جا سکے۔ اور حضرت معاذؓ کی اس روایت کو دلیل بنایا کہ وہ اپنے کندھے پر اپنی چادر واپس لے گیا اور سعید کی اس روایت کو دلیل بنایا جس میں کہا گیا ہے کہ ہم زکوٰۃ کی وصولی کے لئے چل نکلتے تو واپس صرف اپنی کھونٹیاں لاتے۔ اور حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ کی تکرار کو دلیل بنایا کہ جب معاذؓ نے یمن کی کچھ بچی ہوئی زکوٰۃ حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی تو حضرت عمرؓ نے ان سے بازپرس کی۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ یہ ساری روایات ثابت کرتی ہیں کہ ہر قوم کے لوگ اپنی قوم کی زکوٰۃ کے اوّلین حق دار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو ضرورت نہ رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی نسبت ان کا پہلا استحقاق سنت نے پڑوس کے احترام اور امیروں کے قریب غریبوں کی رہائش کی بناء پر دیا ہے۔ اگر زکوٰۃ کا عملہ غلطی سے ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل کر دے جب کہ اس جگہ ضرورت مند موجود ہوں تو حکومت اس کو واپس وہاں لوٹائے جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کیا اور جیسا کہ سعید بن جبیر نے فتویٰ دیا ہے۔ البتہ ابراہیم نخعی اور حسن بصری نے ایسے شخص کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جو اپنے رشتہ دار کو ترجیح دے۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ کسی کو اپنی ذاتی زکوٰۃ اور مال کے بارے میں تو ایسا کرنا جائز ہے مگر عوام کی زکوٰۃ جو حکومت وصول کرتی ہے اس کے بارے میں ایسا کرنا جائز نہیں۔ جب متفقہ قاعدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ وہیں پر تقسیم ہونی چاہئے جہاں سے اکٹھی ہو اسی طرح یہ بھی متفقہ ہے کہ کسی جگہ کے رہنے والے لوگوں کو اگر پوری زکوٰۃ یا کچھ حصے کی ضرورت نہ ہو اس بناء پر کہ وہاں کسی قسم کا مستحق نہ ہو یا زکوٰۃ زیادہ ہو اور مستحقین کی تعداد کم ہو تو وہاں سے دوسری جگہ زکوٰۃ کو منتقل کرنا جائز ہے یہ منتقلی یا تو حکومت کو ہو یا بالفاظ دیگر مرکزی زکوٰۃ فنڈ کو ہو تاکہ حسب ضرورت وہ اسے خرچ کرے اور یا پھر یہ منتقلی قریبی دوسری آبادی میں ہو۔ اصولاً تو زکوٰۃ وہاں تقسیم ہو جہاں سے اکٹھی ہو تاکہ پڑوس کا احترام ہوسکے اور غربت مٹاؤ پالیسی کو منظم کیا جاسکے۔ اور ہر صوبے کو خود کفالت کی تربیت دی جا سکے اور اندرونی طور پر اپنے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ یہ وجہ بھی ہے کہ علاقے کے لوگوں کی نظریں اسی علاقے سے وصول کی گئی زکوٰۃ پر چونکہ جمی رہتی ہیں اس لئے ان لوگوں کا حق دوسروں کی نسبت پہلے بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل لوگ مقامی حکومت کے نظام کو اپناتے ہیں اور اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بااین ہمہ میں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں دیکھتا کہ اگر کوئی عادل حکومت شوریٰ کے مشورے سے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر اور اسلام کی بہتری کی خاطر اس قاعدہ کو چھوڑے بلکہ ایسا کرنا ضروری

ہوگا۔ مثلاً کافر کسی ملک پر حملہ آور ہوں اور اس کے باشندے فوری ضرورت مند ہو جائیں یا سیلاب، زلزلہ یا عظیم حادثات کا شکار ہو جائیں یا قحط سے دوچار ہو جائیں۔ اس لئے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور سب ایک ہی امت ہیں۔ اس بارے میں امام مالکؒ نے جو فرمایا ہے مجھے بہت پسند ہے کہ زکوٰۃ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں سوائے اس کے کہ کسی جگہ ضرورت پڑ جائے تو حکومت اپنی صوابدید اور غور و فکر کے تحت ایسا کر سکتی ہے(۵۵)۔

امام مالکؒ کے شاگرد ابن قاسم نے کہا ہے کہ اگر کچھ زکوٰۃ کو ضرورت کے تحت دوسری جگہ منتقل کیا جائے تو میں اسے درست سمجھتا ہوں۔ سحنون سے نقل ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر حکومت کو معلوم ہو کہ فلاں جگہ سخت ضرورت ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ زکوٰۃ کے ایک حصے کو اصل مستحقین کو دینے کے بجائے وہاں منتقل کرے اس لئے کہ ضرورت پڑ جائے تو اس کو دوسری باتوں پر اوّلیت دی جانی چاہیے۔ اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ تو اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس پر ظلم یا زیادتی کرتا ہے۔

''المدونۃ'' میں امام مالکؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص کو مصر میں قحط والے سال لکھ بھیجا، عربوں کی مدد کیجئے۔ میرے پاس اتنا قافلہ بھیج جس کا ایک سرا میرے پاس ہو اور دوسرا آپ کے پاس، جو کپڑوں میں آٹا اٹھائے ہوئے ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اسے اپنی صوابدید کے مطابق بانٹتے رہے اور اس کے لئے لوگوں کی ذمہ داریاں لگائی تھیں اور انہیں حکم دیتے کہ اونٹ ذبح کرتے وقت موجود رہیں اور فرماتے کہ عربوں کو اونٹوں سے پیار ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اونٹ ذبح کرنے میں متامّل ہوں لہذا انہیں ذبح کرو اور ان کے گوشت اور چربی کا سالن بناؤ اور جن کپڑوں میں آٹا آیا ہے وہ کپڑے پہنیں تو مشکل گھڑیوں میں یوں اسلامی خطوں کو خود کفالت حاصل ہو سکتی ہے اور یوں ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ ایک امت کا حال تو یہ ہوا کرتا ہے جو علاقائی تعصبات والے نعروں کے بالکل برعکس ہے۔

دوم: گروپوں اور افراد میں انصاف قائم کرنا

بہتر تقسیم میں یہ بھی شامل ہے کہ ان گروپوں میں بھی انصاف کیا جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا مستحق قرار دیا ہے اور پھر ہر گروپ کے اندر افراد میں بھی انصاف کیا جائے۔ انصاف کا مطلب یہ نہیں کہ سب کو ایک برابر دیا جائے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ نے کہا ہے بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ اہلیت اور ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے اور اسلام کے بلند مفاد کو بھی سامنے رکھا جائے۔

درج ذیل کچھ اصول ہیں جن کی پابندی چاہئے تاکہ گروپوں اور افراد میں تقسیم کے بارے میں ترجیحی رائے پر عمل ہوسکے:

۱۔ مال زیادہ ہو اور سارے گروپ پائے جاتے ہوں اور سب کی ضرورتیں تقریباً برابر ہوں تو سب کو شامل رکھا جائے۔اور کسی گروپ کو استحقاق کے باوجود محروم نہ رکھا جائے۔

۲۔ آٹھوں مصارف میں سے عملاً موجود ہر گروپ کو شامل کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ سارے گروپوں کو برابر رکھا جائے بلکہ تعداد اور ضرورت کے مطابق انہیں دیا جائے کیوں کہ بعض دفعہ کسی صوبے میں ہزار فقیر ہوتے ہیں مگر وہاں بمشکل دس مقروض یا ضامنی اور مسافر نہیں ہوتے۔ تو اب دس کو ہزار کے برابر کیوں دیا جائے۔ اس لئے ہمارے خیال میں امام شافعیؒ کی رائے کے برعکس امام مالکؒ اور ان سے قبل ابن شہاب کی رائے کے مطابق عمل کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جس گروپ کی تعداد اور ضروریات زیادہ ہوں اس کو زیادہ مقدار دی جائے۔

۳۔ ساری زکوٰۃ بعض گروپوں کو مخصوص طور پر دینا جائز ہے اگر کوئی شرعی مفاد اس سے حاصل ہوتا ہو۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک گروپ کے تمام افراد کو ایک برار دیا جائے بلکہ ضرورتوں کے مطابق کمی بیشی کرنا جائز ہے کیوں کہ ہر ایک کی ضرورتیں ایک برابر نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی وجہ یا فائدہ موجود ہو اور دوسروں پر زیادتی نہ ہو، اور صرف خواہش اور چاہت کی بنیاد پر نہ ہو تو کسی فرد کو زیادہ دینا ضروری ہے[(۵۶)]۔

۴۔ فقیروں اور مسکینوں کے گروپوں کو بقیہ تمام گروپوں پر مقدم رکھا جانا چاہئے کیوں کہ زکوٰۃ کا اوّلین ہدف انہی لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہے خود حضورﷺ نے معاذ وغیرہ والی حدیث میں صرف اسی مصرف کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے۔ اور یہ اس لئے کہ اس مصرف کی خاص اہمیت ہے۔ اس لئے حکومت کے لئے جائز نہیں کہ زکوٰۃ کے مال کو مثلاً رضاکار فوجیوں پر خرچ کرے اور ایسے غریبوں اور ضرورت مندوں کو چھوڑ دے جو بھوک و ہلاکت کا شکار اور حسد و بغض کی آگ میں جھلساں ہیں۔ لیکن یہ تب جب کوئی ایسے ناگہانی اور عارضی حالات درپیش نہ ہوں جیسے کوئی کافر مسلم علاقے پر حملہ آور ہو اور اس کا مداوا ہر چیز پر مقدم ہو تو ایسے حالات میں جہاد کی تیاری ہر چیز پر مقدم ہوگی۔

۵۔ چاہئے کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے عملہ کے اخراجات کی آخری حد کی تعیین کے لئے امام شافعیؒ کے مذہب کو اپنایا جائے جو انہوں نے زکوٰۃ کی آمدنی کی مقدار کے برابر مقرر کی ہوئی ہے لہذا

اس سے زائد جائز نہ ہوگا۔ کیوں کہ عائد کردہ اکثر ٹیکسوں کے بارے میں بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان ٹیکسوں کی آمدنی کی بڑی مقدار وصول کرنے والی انتظامیہ پر خرچ ہوتی ہے اور ٹیکس گزاروں کے پیسے خزانے تک بہت کم مقدار میں پہنچ پاتے ہیں کیوں کہ وصولیوں میں بڑی فضول خرچی ہوتی ہے، منصب دار لے لیتے ہیں، دفاتر کی دیکھ بھال اور نمائشی و زیبائشی کاموں پر خرچ ہو جاتے ہیں، مشکلات پیدا کی جاتی ہیں اور بہت سے اخراجات اٹھائے جاتے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ پیسے ایسی مدات میں سے لئے جاتے ہیں جو خرچ کرنے کی مستحق ہوتی ہیں۔ اس کی طرف پچھلی فصل میں توجہ دلائی گئی ہے۔

سوم: مستحقین زکوٰۃ کی اہلیت کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا

مطلب یہ ہے کہ ہر چاہنے والے کو زکوٰۃ نہ دی جائے اور نہ ہر ایسے شخص کو جو بظاہر غریب نظر آئے یا اپنے کو مقروض اور مسافر ظاہر کرتا ہو یا مجاہد ہونے کا دعویدار ہو بلکہ ضروری ہے کہ قریبی جاننے والوں کے ذریعے سے مستحق زکوٰۃ ہونے کے بارے میں تسلی اور اطمینان حاصل کیا جائے۔ جو چیزیں اس بارے میں مدد دے سکتی ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ جیسا کہ بتا دیا گیا کہ ہر محلّہ میں مستحقین کو زکوٰۃ دی جائے کیوں کہ وہاں سارے لوگ ایک دوسرے کے حالات اور مجبوریوں سے صحیح واقف ہوتے ہیں اور سچے اور جھوٹے غریبوں کو بخوبی جان سکتے ہیں۔

زکوٰۃ کے استحقاق کے بارے میں تسلی کے حصول کے لئے حضور ﷺ کی اس حدیث کو بنیاد بنایا جائے جو امام احمد اور مسلم نے قبیصہ کے متعلق نقل کی ہوئی ہے، اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ بھیک صرف تین صورتوں میں جائز ہے:-

۱۔ کسی نے کوئی ضمانت دی ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ اسی مقدار تک وصول کرے اور پھر رک جائے۔

۲۔ کسی کو کوئی مالی حادثہ لاحق ہوا ہو اس کے لئے ضروریات زندگی کی حد تک بھیک مانگنا جائز ہے۔

۳۔ کسی کو کھانا نہ ملتا ہو اور اس کے قریبی لوگوں میں سے تین گواہی دیں کہ اس کے پاس کھانے کے لئے نہیں تو اس کے لئے بھی بھیک مانگنا جائز ہے تا کہ وہ ضروری خوراک حاصل کر سکے۔

امام خطابی نے کہا ہے کہ اس حدیث میں بڑا علم اور بہت سے فوائد موجود ہیں اور یہ علم و حکمت کے ابواب میں شامل ہے کیوں کہ اس کی رو سے بھیک مانگنے والے لوگ تین قسم کے ہوتے

ہیں۔ ایک امیر اور دو غریب۔ غربت کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ظاہری اور پوشیدہ۔ ایسا امیر جس کے لئے بھیک مانگنا جائز ہو وہ ضمانتی ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ کسی قوم میں خونین یا مالیاتی جھگڑا ہو جائے اور اس کی وجہ سے ان میں عداوت اور دشمنی پیدا ہو اور اس سے بڑے فتنے کا اندیشہ ہو تو کوئی شخص دونوں کے درمیان پڑ کر ان میں صلح کرانے کی کوشش کرے اور اس ضمن میں ایک فریق کے لئے راضی کرنے کے لئے اسے مالی ضمانت دے تاکہ الفت و محبت واپس آئے اور انتقام کا جذبہ ختم ہو جائے۔ اس طرح یہ شخص نیک کام کرتا ہے اور اس ضمانت سے وہ اصلاح چاہتا ہو تو اب یہ اچھا نہ ہوگا کہ اس پر مالی بوجھ ڈال دیا جائے بلکہ ضمانت کی ادائیگی کے لئے اس کی مدد کر لینی چاہئے اور اسے اس قدر زکٰوۃ دی جانی چاہئے جس سے وہ ضمانت کی رقم ادا کر سکے اور ضمانت سے عہدہ برآ ہو جائے۔ غریب کی دو قسموں میں سے پہلی قسم کا غریب وہ ہے جس کو ایسا مالی حادثہ پیش آیا ہو جس سے اس کا مال ضائع ہوا ہو۔ عام طور پر یہ حادثہ سیلاب کی شکل میں ہوتا ہے یا ژالہ باری سے کھیتی اور باغات برباد ہوں۔ یہ چیزیں نظر آنے والی اور نہ چھپنے والی ہوتی ہیں اگر کسی کو یہ پیش آئے اور وہ غریب ہو جائے تو اس کے لئے بھیک مانگنا جائز ہے اور لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ اسے زکٰوۃ دیں اور اس بارے میں اس سے استحقاق اور غربت کا ثبوت نہ مانگیں۔

غریب کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی شخص مالدار ہو اور سب کو اس کا پتہ ہو مگر وہ کہے کہ میری چوری ہوگئی یا کسی نے میری امانت ہڑپ کر دی یا ایسی کوئی دوسری چھپی بات ہو جو دکھائی نہ دیتی ہو تو ایسی صورت میں ثبوت کے بغیر اس شخص کو زکٰوۃ نہیں دینی چاہئے بلکہ اس کے قریبی جاننے والوں کے ذریعے سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اور حدیث کے ان الفاظ کا مطلب بھی یہی ہے کہ یہاں تک کہ اس کی قوم میں سے تین اچھے لوگ اس کی گواہی دیں کہ یہ شخص فاقہ میں مبتلا ہے اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ ظاہر بین اور بے خبر قسم کے نہیں بلکہ سمجھ دار اور باخبر قسم کے تین آدمی یہ کہیں کہ ہاں یہ غریب ہے۔ یہ گواہی نہیں بلکہ تعارف اور شناسائی والی بات ہے۔ لہٰذا تین افراد کی گواہی ضروری نہیں بلکہ کوئی ایک رشتہ دار، پڑوسی یا جاننے والا بھی کہے کہ یہ سچا ہے تو اس کو زکٰوۃ دی جائے گی۔

یہ چیز بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ غریب کی تصدیق کرنے والوں کے لئے باخبر اور سمجھ دار ہونا ضروری ہے کیوں کہ ناواقف اور ناسمجھ آدمی بسا اوقات گہرائی تک نہیں پہنچتا بلکہ صرف ظاہری حالت سے دھوکہ کھاتا ہے۔ اور خود دار غریب کو مالدار اور مانگنے والے کو غریب سمجھتا ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے مدینہ کے غریبوں کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ زکٰوۃ کے اوّلین

مستحق ہیں اور فرمایا ہے: "للفقراء الذين احصروا في سبيل الله لا يستطيعون ضربا في الارض يحسبهم الجاهل اغنياء من التعفف" (سورہ البقرہ، آیت: ۲۷۳)۔ چاہئے کہ یہ ارشاد بنیاد بنے ایسے غریبوں کے بارے میں جو بظاہر غریب نظر نہ آتے ہوں اور یہ کام خفیہ طور پر بھی کیا جا سکتا ہے تاکہ لوگوں میں ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

مکمل اسلامی نظام کا نفاذ

مذکورہ تمام شرائط سے پہلے نظام زکوٰۃ کی کامیابی کے لئے ایک ضروری شرط کا پورا ہونا ضروری ہے اگرچہ اس کا تذکرہ آخر میں کیا جا رہا ہے مگر مقام و مرتبہ کے لحاظ سے یہ سب سے مقدم ہے۔

وہ شرط یہ ہے کہ پورے اسلام پر عمل ہو بالفاظ دیگر پورا اسلامی انقلاب آئے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرنے والا ایک ایسا اسلامی معاشرہ تشکیل دیا جائے جو فرائض کی تعمیل اور حرام سے اجتناب کرنے والا ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل نہ کرنے والا اور حرام سے نہ بچنے والا اور اسلامی تعلیمات اور تربیت کا پابند نہیں ہوتا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف زکوٰۃ ہی کا حکم نہیں دیا ہے اس لئے کہ تنہا زکوٰۃ اسلامی معاشرہ کو قائم نہیں کر سکتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے کبھی تو ہمیں زکوٰۃ کے ساتھ ملا کر نماز کا بھی حکم دیا ہے اور کبھی زکوٰۃ کا حکم دیگر فرائض کے ساتھ ملا کر دیا ہے۔ لہٰذا کسی ایسے معاشرے میں زکوٰۃ کا نظام کامیاب نہیں ہوسکتا جو نماز کا پابند نہ ہو اور خواہشات نفسانی کا تابع ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "واقيموا الصلاة وآتوا الزكوٰة" یعنی نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے میں اس سے ضرور لڑوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بیس مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

زکوٰۃ کا نظام ایسے معاشرے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو فحاشی اور منکرات سے خاموشی اختیار کئے ہوئے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فحاشی اور منکرات کو قرآن کریم میں کئی مقامات پر زکوٰۃ اور نماز کے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔ جیسے:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر و يقيمون الصلاة و يوتون الزكوٰة ويطيعون الله و رسوله (سورہ توبہ آیت ۷۱)

اور

"لینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلاۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (سورۃ الحج آیات ۴۱-۴۰)

زکوٰۃ کا نظام ایسے معاشرے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں شوریٰ کا نظام نہ ہو یا جس میں جابر حکمران مسلط ہو۔ قرآن کریم میں شوریٰ کو نماز اور انفاق کے درمیان کڑی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ انفاق کا لفظ اکثر و بیشتر زکوٰۃ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے "والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلاۃ وامرھم شوریٰ بینھم و مما رزقنا ھم ینفقون" (سورہ شوریٰ آیت ۳۸)۔ ایسے معاشرے میں نظام زکوٰۃ کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں نماز کا نظام خراب ہو، وقت ضائع کیا جا رہا ہو، فحاشی عام ہو، امانتوں میں خیانت ہو رہی ہو اور وعدہ خلافیاں ہو رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاشرے کی خوبیاں اس طرح بیان فرمائی ہیں:-

"قد افلح المومنون الذین فی صلاتھم خاشعون والذین ھم عن اللغو معرضون والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم اوما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک ھم العادون والذین ھم لاماناتھم راعون والذین ھم علی صلواتھم یحافظون. (سورہ المومنون آیات ۱-۹)

اسلامی احکامات و فرائض باہم اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کا دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں اور افراد و معاشرے پر اس کے اثرات ڈالنے میں ہر حکم کا اپنا الگ کردار ہوتا ہے۔ کسی ایک کے نہ ہونے سے ان کی مجموعی طاقت متاثر ہو جاتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہم سے پہلے بنی اسرائیل پر گرفت کی ہے کہ انہوں نے دین کا ایک حصہ اپنایا اور دوسرا حصہ چھوڑ دیا تھا۔ کتاب کے ایک حصے پر ایمان تھا اور دوسرے پر نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک منکم الاخزی فی الحیاۃ الدنیا و یوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعملون اولئک الذین اشتروا الحیاۃ الدنیا بالآخرۃ فلا یخفف عنھم العذاب ولاھم ینصرون" (سورۃ البقرہ آیات ۸۶-۸۵)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ میرے بھیجے ہوئے پورے احکامات پر فیصلے کریں اور

اسے اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں اور مکاریوں سے خبردار کیا ہے کہ کہیں وہ اسے اللہ تعالی کے بعض احکامات کے بارے میں بے راہ نہ کر دیں یہ حکم رسول اللہ کے بعد مسلمان حکمران کے لئے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وان احکم بینھم بما انزل الله ولا تتبع اھواء ھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل الله" (سورۃ المائدۃ آیت ۴۹)

اسلامی نظام ناقابل تقسیم ہے

محکمہ زکوٰۃ کا قیام یا زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کو منظم کرنے کے لئے قانون جاری کرنا مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی زندگی کی طرف درست رجوع کرنے ایک حصہ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اسلامی نظام زندگی ایک ایسا مربوط نظام ہے جس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کے ایک حصے کو اپنا کر اس کے دوسرے حصے کو چھوڑا جا سکتا ہے کیوں کہ ہر حصہ دوسرے کے لئے شرط اور تکمیل کرنے والے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک حصے کو اپنانا بے سود یا کم از کم کم نفع بخش بنتا ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور اسلام کی پوری تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہے: "یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطن انه لکم عدومبین" (سورہ البقرہ آیت ۲۰۸) یعنی مسلمانو! پورے اسلام مین داخل ہو، شیطان کی پیروی مت کرو کیوں کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

یہاں سلم کا لفظ استعال ہوا ہے جو اسلام کا مترادف ہے کیوں کہ اسلام اپنی اور معاشرہ کی سلامتی کا سرچشمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دین اسلام میں یکسر داخل ہو یہودیوں کی طرح نہ بنو جو اسلام میں جزوی طور پر داخل ہوئے اور بعض قدیم روایات اور شریعت پر بھی قائم رہے۔ قرآن نے اس چیز کو مسترد کیا اور کہا کہ مسلمان ہونا ہے تو پورے کے پورے ہو جاؤ، اسلام کی پوری تعلیمات پر عمل پیرا اور اوامر و نواہی کے پابند ہو جاؤ(۵۷)۔

پورے اسلام کے بجائے اس کے ایک حصے کو قبول کرنا خود اسلام کی نفی کرنا ہے کیوں کہ وہ تو اپنے احکامات اور تعلیمات کے حصے بخرے کرنے کو مسترد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کرنے سے

معاشرے کے مسائل کا شافی علاج بھی نہیں ہوسکتا۔ یوں سمجھیں کہ آج کل کا کوئی معاشرہ جس میں اسلام ایک پردیسی کی حیثیت رکھتا ہو، اگر نظامِ زکوٰۃ جیسے کسی بھی نظام کو بھی تنہا نافذ کرنا چاہے گا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟۔

میرے خیال میں تو یہ نکلے گا کہ:-

(ا) معمولی وصولی بکثرت غربت اور اس سے پیداشدہ ڈھیروں معاشرتی مسائل کے حل کے لئے ناکافی ہوگی۔ وصولی کی کمی کے کئی اسباب میں سے چند اہم میرے خیال میں یہ ہیں:

-- اوّل: اکثر لوگ دینی شعور و جذبہ سے عاری ہوتے ہیں جس کا سبب خارجی کافرانہ نظریات کی یلغار ہے اس کے علاوہ لوگ حکومت کو اس لئے بھی زکوٰۃ نہیں دینا چاہتے کہ لوگ پہلے سے کئی حکومتی ٹیکسوں میں دبے رہتے ہیں اور لوگوں کو حکومت پر اعتماد بھی نہیں ہوتا کیوں کہ وہ دین کی پابند نہیں ہوتی اور لوگ سمجھتے ہیں کہ حکومت زکوٰۃ کو بھی دیگر ٹیکسوں کی طرح ناجائز کاموں میں خرچ کرے گی۔

-- دوم: اس ملک کے عام باشندے کوئی خاص دولت اور آمدنی والے نہیں ہوتے اور اس قابل نہیں ہوتے کہ زکوٰۃ نکال سکیں کیوں کہ آج کل کے مسلمان اس طرح مسرفانہ زندگی گزار رہے ہیں نمائشی، زیبائشی، عیاشانہ اور ممنوعہ قسم کے غیر مفید اعمال میں مصروف رہتے ہیں اور اس طرح کافروں کی پوری پوری نقالی کر رہے ہیں اور نہایت افسوس ہے کہ اس کی سخت پابندی کی جاتی ہے اور اس کے لئے بیرونی دنیا سے چیزیں درآمد کی جاتی ہیں جس سے ہماری آمدنی اور مالی قوت ایسے کاموں میں خرچ ہو جاتی ہے جن کا نہ دنیاوی فائدہ ملتا ہے اور نہ آخرت کا۔

(ب)ایسی معمولی وصولی کا ایک حصہ تو دفاتر، سامان اور کارکنان پر خرچ ہوتا ہے جس کی وجہ انتظامی پیچیدگیاں اور زیبائشی اور سطحی ترجیحات ہیں جو غریبوں تک پہنچنے سے قبل ہی سارا پیسہ ہڑپ کر جاتی ہیں۔

(ج) تقسیم کے وقت ایسی بدنظمی اور ہڑبونگ پیدا ہوتی ہے کہ بہت سے مستحق لوگ محروم رہ جاتے ہیں اور بہت سے غیر مستحق لوگ حاصل کر لیتے ہیں اس لئے کہ تربیت کا فقدان ہوتا ہے، ایمان کمزور ہوتا ہے اور اس بارے میں زکوٰۃ کے منتظمین اور عام لوگ سب برابر ہیں۔

(د) نتیجۃً تنہا زکوٰۃ غریبوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتی اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ پورا اسلامی نظام شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے اسلامی نظام کے بارے میں

شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔

مذکورہ مثال سے واضح ہوتا ہے کہ موجودہ خارجی نظاموں کو چند اسلامی تعلیمات و احکامات کے پیوند لگانے سے مسائل حل نہیں ہوتے اور نہ ہی بیماری کا شافی علاج ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دیکھئے المحلی ج۶، ص ۴۰-۲۳۳

۲۔ دیکھئے ''الدرر البھیۃ، الشوکانی اور اس کی شرح از صدیق حسن خان، معروف بہ ''الروضۃ الندیۃ''، جلد اوّل، ص ۹۶-۱۹۲

۳۔ شرح الترمذی، جلد سوم، ص ۱۰۴

۴۔ بدائع الصنائع جلد دوم

۵۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ

۶۔ صحیح ابن خزیمہ، حاکم، جلد اوّل، ص ۳۹۰، بہ روایت جابرؓ۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ روایت امام مسلم کی شرائط صحت پر پوری ہے۔ امام ذہبیؒ نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔ جبکہ حافظ نے جلد سوم، ص ۱۷۵ پر کہا ہے کہ ابوزرعہ اور بیہقی وغیرہ نے اس روایت کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ بزار کے نزدیک ہے۔

۷۔ المحلی، جلد ۶، ص ۱۵۹

۸۔ احمد اور ابو داؤد بہ روایت علیؓ

۹۔ دیکھئے فقہ الزکوٰۃ، جلد اوّل، ص ۳۴۹ وما بعد، طبع پنجم، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

۱۰۔ ارشاد الفحول، شوکانی، ص ۲۷۲

۱۱۔ فقہ الزکوٰۃ، جلد اوّل، ص ۵۷-۳۵۶، طبع پنجم

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ کتاب الاموال، ص ۵۳۱

۱۴۔ سورہ الذاریات، آیت ۱۹

۱۵۔ رازی، تفسیر کبیر، جلد ۱۶، ۱۱۴

۱۶۔ فتح القدیر، ابن ہمام، جلد ۲، ص ۴۸۷، مطبوعہ بولاق

۱۷۔ کتاب الاموال، ص ۵۸۹، یہ روایت متعدد واسطوں مگر کمزور واسطوں سے مروی ہے تاہم ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت ہیں اور فقہاء نے اس کو زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی کے لئے دلیل بنایا ہے۔ فتح الباری، جلد ۳،

ص ۳۱۴

۱۸۔ کتاب الاموال، ص ۹۳-۵۹۲۔ اس حدیث کے راوی احمد اور بخاری و مسلم ہیں۔ نیل الاوطار، جلد۴، ص ۱۴۹

۱۹۔ معالم السنن، جلد۲، ص ۸۹-۱۸۸، تعلیق ابن القیم فی تہذیب سنن ابی داؤد۔

۲۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد۴، ص ۴۴

۲۱۔ الشافعی، الام، جلد۲، ص ۱۴، بولاق

۲۲۔ کاسانی، بدائع الصنائع، جلد۲، ص ۷

۲۳۔ الجامعہ العربیہ، حلقہ دراسات اجتماعیہ، تیسرا سیشن، بحث زکوٰۃ

۲۴۔ یہ شرح امام شافعی سے منقول ہے۔ روایت کی دوسری تشریح زیادہ مشہور اور ترجیحی ہے اور وہ یہ کہ یہ اس لئے تاکہ یہ لوگ اسے خود کھائیں، کسی کو دے دیں وغیرہ اور اس کی زکوٰۃ ان سے نہ مانگی جائے۔ فقہ الزکوٰۃ، جلد۱، ص ۳۸۶ ومابعد، طبع ۱۸

۲۵۔ سورہ القصص، آیت ۲۶

۲۶۔ سورہ یوسف، آیت ۵۵

۲۷۔ یہ روایت احمد، ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کی ہے، ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور حاکم نے اور ذہبی نے اسے شرائط مسلم کے تحت صحیح قرار دیا ہے۔

۲۸۔ مسلم اور ابو داؤد وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے۔ منذری نے بھی الترغیب میں اسے نقل کیا ہے۔

۲۹۔ طبرانی نے معجم کبیر میں اسے روایت کیا ہے۔ منذری کے مطابق اس کی سند صحیح ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد جلد۳، ص ۸۶ پر لکھا ہے کہ اس کے راوی صحیح روایات والے ہیں۔

۳۰۔ بخاری، مسلم اور ابو داؤد۔

۳۱۔ کتاب الخراج، ص ۸۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۷۶

۳۳۔ دیکھئے دردیر کی الشرح الکبیر اور دسوقی کا حاشیہ جلد ۱، ص ۵۰۲

۳۴۔ شرح الرسالۃ، ص ۳۴۰

۳۵۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۳۴۰

۳۶۔ المغنی، جلد۳، ص ۶۵

۳۷۔ فقہ الزکوٰۃ، جلد ۲

۳۸۔ المنتقی میں شوکانی نے کہا ہے کہ اس روایت کو حاکم نے بخاری اور مسلم کی شرائط صحیح کے مطابق بتایا ہے۔ اس کی سند میں عطا ہیں جس نے معاذ سے خود کبھی نہیں سنا ہے کیوں کہ یہ اُن کی وفات کے بعد یا اسی سال یا ایک سال بعد پیدا ہوئے ہیں۔ نیل الاوطار، جلد۴، ص۱۵۲

۳۹۔ سرخسی، المبسوط، جلد۲، ص ۱۵۷

۴۰۔ بیہقی، السنن الکبیر، جلد۴، ص ۱۱۳، بخاری، کتاب الزکوٰۃ

۴۱۔ المغنی، جلد۳، ص ۶۵

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ المجموع، جلد۵، ص۴۲۹

۴۴۔ فتح الباری، جلد۳، ص ۲۰۰

۴۵۔ مجموع فتاوی ابن تیمیہ، جلد ۲۵، ص ۸۳-۸۲

۴۶۔ حاشیۃ الدسوقی، جلد۱، ص ۵۰۰

۴۷۔ آج کل مال کا مالک کسی دور دراز قصبہ یا صوبہ میں رہتا ہے جبکہ اس کے پیسے دارالحکومت یا بعض اوقات بیرون ملک بینکوں میں ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں مال کی جگہ کو نہیں بلکہ مالک کی جگہ کو ملحوظ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

۴۸۔ نیل الاوطار، جلد۲، ص ۱۹۱

۴۹۔ ترمذی

۵۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد۳، ص ۲۰۵

۵۱۔ کتاب الاموال، ص ۵۹۵

۵۲۔ المغنی، جلد۲، ص ۶۷۲

۵۳۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ۔ دیکھئے نیل الاوطار، جلد۴، ص ۱۶۱

۵۴۔ کتاب الاموال، ص ۵۹۵

۵۵۔ تفسیر قرطبی، جلد۸، ص ۱۷۵

۵۶۔ اس کے بارے میں سب سے بہتر بات میں نے زیدی کی کتاب شرح الازھار جلد۱، ص ۵۱۸ میں پڑھی ہے کہ حکومت کو کمی بیشی کرنا جائز نہیں سوائے اس کے کہ دوسروں پر زیادتی نہ ہو ورنہ جائز نہ ہوگا۔ زیادتی یہ ہے کہ مثلاً ایک مقروض کو اتنا دیا جائے جس سے اس کا قرضہ اتر جائے مگر دوسرے کو اتنا نہ دیا جائے جس سے اس کا قرضہ اتر جائے۔ یا ایک مسافر کو اتنا دیا جائے کہ وہ اپنے گھر پہنچ سکے مگر دوسرے کو اتنا نہیں یا ایک غریب کو

اتنا دیا جائے کہ اس کے گھر والوں کے لئے کافی ہو لیکن دوسرے کو اتنا نہیں حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ موجود نہ ہو مثلاً پہلے شخص کی تالیف مقصود ہو۔ اگر وجوہات زیادہ ہوں تو کسی کو زیادہ دیا جا سکتا ہے مثلاً کوئی غریب، محنت کش اور مقروض ہو تو اس کو دوسروں سے زیادہ دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کے استحقاق کے اسباب زیادہ ہیں۔

۵۷۔ تفسیر ابن کثیر، جلد ا، ص ۲۴۷